دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۱۳ء عدد ۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مولانا سید محمد رابع ندوی
لکھنؤ

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی
علی گڑھ

(مرتبہ)

اشتیاق احمد ظلی

محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

دارالمصنّفین کی تاسیس پر پچیس سال پورے ہوئے تو فطری طور پر بہت سے بہی خواہوں کی خواہش ہوئی کہ اس موقع کی اہمیت کے پیش نظر سلور جوبلی تقریبات کا اہتمام کیا جائے ۔ یہ خواہش کچھ بیجا نہ تھی ۔ اکیڈمی نے نہ صرف یہ کہ اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کر لیے تھے جو اُن حالات میں بجائے خود ایک اہم واقعہ تھا ، بلکہ اس لیے بھی کہ اس نے اس قلیل مدت میں ان مقاصد کی تکمیل میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تھی ، جن کے حصول کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا تھا ۔ لیکن ''نمی رویم برا ہے کہ کارواں رفتست'' کے مصداق معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی نے عام روش کی پیروی کو مناسب نہیں سمجھا ۔ البتہ اکیڈمی کی تاریخ کے اس واقعہ کو یادگار بنانے کے لیے انہوں نے ایک زیادہ نتیجہ خیز طریقہ اختیار کیا اور 'حیات شبلیؒ' کے نام سے دارالمصنّفین کے موسس کی ایک مبسوط سوانح حیات لکھنے کا اہتمام کیا جس نے اسلامیانِ ہند کی پچاس سالہ مذہبی اور علمی تاریخ کی حیثیت اختیار کر لی ۔ پھر جب دارالمصنّفین نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کیے تو اس وقت کے ذمہ داروں نے وقت اور حالات کے اقتضا کے مطابق بڑے اعلی پیمانہ پر گولڈن جوبلی تقریبات کا اہتمام کیا ۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شرکت نے اس کی رونق کو دوبالا کیا ۔ شاید بہت سے لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو دارالمصنّفین سے بڑا تعلق خاطر تھا اور وہ ۱۹۳۶ء سے اپنی وفات تک اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی جگہ پر جناب فخر الدین علی احمد کا انتخاب عمل میں آیا جو اس وقت مرکزی کابینہ میں وزیر تھے ۔ وہ بھی اپنی وفات تک مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے ۔ اس طرح دارالمصنّفین کو یہ افتخار حاصل ہے کہ ہندوستان کے دو صدر اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے ہیں ۔ گولڈن جوبلی کے موقع پر اپنے خوبصورت

خطبہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے دارالمصنّفین کو ایک ''سراج منیر'' سے تعبیر کیا اور ''نفسِ مضمون کی معروضیت، لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اور ان سے بھی وہ نمایاں قلب و نظر کی وسعت'' کو اس کی اہم خصوصیات میں شمار کیا۔ ۲۰۱۴ء میں اس 'سراج منیر' کو علم و ادب اور تحقیق و تصنیف کی دنیا میں ضوفشانی کرتے ہوئے سو سال پورے ہونے والے ہیں۔ کسی بھی ادارے کی زندگی میں اس واقعہ کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ دارالمصنّفین کے لیے اس کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس نے اس مدت کا بڑا حصہ نہایت نامساعد حالات میں گذارا ہے۔ اس کے باوجود اس نے جو کام کیا ہے وہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے غیر معمولی ہے۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں کوئی دوسرا ادارہ اس کا شریک و سہیم نہیں۔ ملک و ملت کے لیے دارالمصنّفین کی خدمات اس قابل ہیں کہ آبِ زر سے لکھی جائیں۔

ساتھ ہی علامہ شبلیؒ کو اس عالمِ فانی سے رخصت ہونے پر بھی ایک صدی پوری ہونے والی ہے۔ اس سے اس موقع کی اہمیت غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ یہ علامہ شبلیؒ کے انتقال اور دارالمصنّفین کی تاسیس جیسے دو نہایت اہم واقعات کی صدی تقریبات ہوں گی اس لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں اس طرح منایا جائے جو ان کے شایانِ شان ہو۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی موقع پر اپنے لائقِ احترام اسلاف کی قائم کی ہوئی دونوں روایتوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس موضوع پر کتابیں بھی شائع کی جائیں اور علمی مذاکروں کا اہتمام بھی کیا جائے۔ اس کے علاوہ دارالمصنّفین کی خدمات اور مستقبل کے لیے اس کے منصوبوں نیز علامہ شبلیؒ کے مشن اور وژن کے تعارف اور توسیع کے لیے دوسرے ممکنہ ذرائع بھی اختیار کیے جائیں۔ اس منصوبہ کے مطابق کتابوں کی اشاعت کی ابتدا کی جا چکی ہے اور اس موضوع پر دو کتابیں 'کتابیات شبلی' اور 'آثار شبلی' شائع ہو چکی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں دارالمصنّفین کے اعزازی رفیق ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی تصنیف ہیں اور مطالعات شبلی کے

موضوع پر اہم پیش رفت کی حیثیت رکھتی ہیں۔اسی موضوع پر معروف محقق ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب کی کتاب ''شبلی کی علمی اور ادبی جہات'' پریس کے لیے تیار ہے اور انشاء اللہ جلد ہی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ مطالعات شبلی میں دلچسپی رکھنے والوں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہماری درخواست پر آج کل ڈاکٹر شمس بدایونی صاحب 'کلیات مکاتیب شبلی' کی ترتیب، تدوین اور تحقیق میں مصروف ہیں۔اس میں علامہ شبلیؒ کے جملہ دستیاب مکاتیب کا احاطہ کیا جائے گا۔ یہ ایک بڑا اور دشوار طلب کام ہے لیکن شمس صاحب اس دریا کے پرانے شناور ہیں اور تدوین و تحقیق کے صبر آزما تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا پورا ملکہ رکھتے ہیں۔مکمل ہونے پر شبلیات پر کام کرنے والوں کے لیے یہ ایک بڑا قیمتی تحفہ ہوگا۔انگریزی زبان میں علامہ شبلی کی تصنیفات، افکار اور نظریات کے تعارف کا کام بھی ابھی باقی ہے۔ یہ وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے کہ وسیع تر علمی دنیا کو ان سے روشناس کرایا جائے۔اس سلسلہ میں بھی بعض منصوبے زیر غور ہیں۔انشاء اللہ ان کی تکمیل کا بھی اہتمام کیا جائے گا۔اسی طرح اس موقع پر دارالمصنّفین میں ایک اعلیٰ درجہ کے بین الاقوامی سمینار کے انعقاد کا منصوبہ ہے۔اکیڈمی کے علاوہ ان مقامات پر بھی علمی مذاکروں اور سمیناروں کے انعقاد کی کوشش کی جائے گی جہاں سے علامہ شبلیؒ اور دارالمصنّفین کا خاص تعلق رہا ہے۔ہم پروفیسر اختر الواسع صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس سلسلہ میں پہل کی اور ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس موقع پر ایک اعلیٰ درجہ کے سمینار کے انعقاد کا اعلان کر چکے ہیں۔روزنامہ انقلاب میں شائع ہونے والے اپنے ایک حالیہ مضمون میں انہوں نے صدی تقریبات کے سلسلہ میں جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے ان پر پوری سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔صدی تقریبات کے سلسلہ میں محبان شبلی اور قدر دانان دارالمصنّفین کے مشورے سے ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

مقالات

غرائب اللغات پر خان آرزو کے حواشی
اور دیگر متعلقہ مباحث

بیادِ رشید حسن خان (۱۹۳۰-۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر عارف نوشاہی

میر عبد الواسع ہانسوی (ہانسی، ضلع حصار، ریاست ہریانہ) عالم گیری عہد سلطنت (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ/ ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کے فارسی مصنف تھے(۱)۔ان کی دست یاب تصانیف پر نظر ڈالیں تو وہ زیادہ تر مقامی ہندوستانی لوگوں اور مبتدیوں کے لیے فارسی زبان وادب کی تفہیم سے متعلق ہیں۔برّصغیر میں فارسی نصابِ تعلیم میں داخل بعض مقبول عام کتب پر ہانسوی نے شرحیں لکھیں اور فارسی ذخیرۂ الفاظ کے مترادفات طالب علموں کو یاد کروانے اور فارسی زبان کے قواعد سکھانے کے لیے مختصر مگر مقبول عام رسائل تصنیف کیے۔ان کی تا حال دستیاب تصانیف کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱-شرح سکندر نامہ: نظامی گنجوی کی معروف رزمیہ مثنوی کی شرح ہے۔(منزوی، ۷: ۱۳۷)(۲)

۲-شرح بوستان: سعدی شیرازی کی مقبول عام اخلاقی مثنوی کی شرح ہے۔(منزوی، ۷: ۲۸۴)

۳-شرح یوسف وزلیخا: مولانا جامی کی معروف عشقیہ مثنوی کی شرح ہے۔(منزوی، ۷: ۵۷۸)

پروفیسر شعبۂ فارسی، گورڈن کالج، راول پنڈی۔

۴- فارسی زبان کے قواعد پر ان کا مرتبہ رسالۂ عبدالواسع/ رسالۂ قوانین کلیہ فارسی/ دستورالعمل بہت مقبول رہا ہے اور متعدد قلمی نسخوں کے علاوہ اس کی کئی اشاعتیں بھی ہیں۔(منزوی، ۱۳:۲۴۶۲؛ عارف نوشاہی،۲:۹۲۳)۔اسی رسالہ کے خاتمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالواسع، شاعر بھی تھے اور ''خالص''، تخلص کرتے تھے۔اس رسالہ کی بعض اشاعتوں (جیسے مطبوعہ مطبع نول کشور، کان پور، مارچ ۱۸۶۹ء) کا اختتام مصنف کی ایک نظم پر ہوتا ہے جو اگرچہ شاعری کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں ہے، پھر بھی اسے نقل کیا جاتا ہے:

شد پی تفریح طبع دوستان
نسخۂ دلکش تر از صد بوستان
جامع صد گونۂ فیض ازل
نسخۂ مقبول دستور العمل
نی، غلط گفتم مضامین بلند
کردم اندر قید لفظِ پوچ چند
منشاء فخر خودش انگاشتم
خود غلط بود آنچہ من پنداشتم
این عمل کامروز شایانِ من است
روز محشر آفت جانِ من است
من بہ خواب افتادہ ماندم مست و زفت
وقت فرصت ای دریغ از دست رفت
''خالص'' ای مست سخن ہشیار شو
خواب غفلت تا بہ کی؟ بیدار شو

حوض میں یہ اشعار درج کرنے کے بعد اسی نول کشوری ایڈیشن کے حاشیے پر لکھا ہے: 'در بعض نسخ این اشعار یافتہ نشد، محتمل کہ الحاق شدہ باشد (ص ۸۶) یعنی بعض نسخوں میں یہ اشعار نہیں ملتے، احتمال ہے کہ الحاق ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے اسی رسالہ اور انھیں اشعار کو پیش نظر رکھتے

ہوئے مولوی مظفر حسین صبا گوپاموی نے تذکرہ روز روشن (تصنیف ۱۲۹۶ھ؛ مطبوعہ تہران، ۱۳۴۳شمسی، ص ۲۳۶) میں ''عبدالواسع خالص ہانسوی'' کا بطور شاعر ذکر کیا ہے اور نمونۂ کلام کے طور پر اسی رسالے سے چند اشعار نقل کیے ہیں۔ مصرع ''من بہ خواب افتادہ ماندم مست و زفت'' تذکرہ روز روشن میں ''من بہ خواب افتادہ ماندم خالصا'' درج ہوا ہے۔

۵-صمد باری کے نام سے ایک منظوم نصاب بھی ان سے یادگار ہے جس میں فارسی میں مستعمل عربی الفاظ کے مقامی زبان میں مترادفات دیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ متعدد بار چھپ چکا ہے۔ (منزوی، ۱۴: ۱۸۸؛ عارف نوشاہی، ۲: ۸۴۷)

۶-ایک ایسا ہی نصاب جان پہچان بھی عبدالواسع ہانسوی کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ (عارف نوشاہی، ۲: ۸۳۵)

حنفی فقہ پر ایک مقبول عام منظوم کتاب مقدمہ الصلاۃ یا نام حق کی شرح بھی ہانسوی سے منسوب کی گئی ہے۔ (منزوی، ۷: ۳۶۳) جو میرے خیال میں محمد بن غلام محمد گلھوی کی شرح ہے۔

سراج الدین علی خان آرزو (۱۰۹۹-۱۱۶۹ھ/ ۱۶۸۷-۱۷۵۵ء) پر کام کرنے والوں نے بالواسطہ طور پر زوایدالفواید نامی ایک رسالہ ہانسوی سے منسوب کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہانسوی کے زوایدالفواید کی طرز پر آرزو نے بھی زوایدالفواید لکھا تھا۔ (ریحانہ خاتون، ۱۲۹)۔ آرزو کا یہ رسالہ فارسی مصادر اور ان کے مشتقات سے متعلق ہے لیکن آرزو نے زوایدالفواید میں کہیں یہ نہیں بتایا کہ ہانسوی کا زوایدالفواید اس کے پیش نظر تھا۔ اس کی تصدیق رحیم پور نے بھی کی ہے جنھوں نے زوایدالفواید کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے (رحیم پور، ۲۱۳-۲۲۴)۔ ہانسوی کی زوایدالفواید کا ذکر مخطوطات و مطبوعات کی کسی فہرست میں مجھے نہیں ملا، جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ہانسوی نے ایسا کوئی رسالہ تصنیف نہیں کیا ہے۔

اردو زبان کی تاریخ میں عبدالواسع ہانسوی اپنی ایک اور تصنیف غرائب اللغات (اس کے بعد صرف ''غرائب'') سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں ہندوستانی لوگوں (اردو زبان، پنجابی زبان، مقامی بولی) میں رائج غیر مشہور اسماء اور غیر مانوس الفاظ کی تشریح یا وضاحت فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ آخر میں عربی زبان میں جانوروں کی آوازوں اور کُنیتوں کے فارسی مترادفات

دیے گئے ہیں۔خود مصنف نے اس کی وجہ تصنیف یوں بیان کی ہے:

''کثرت الحاح جمع کثیر از اصحاب وفرط اقتراح جم غفیر از اولی الالباب، باعث برآن شد کہ اسمای غیر مشہورہ واشیای موفورہ والفاظ غیر مانوسہ معانی بین الانام مذکورہ را بہ عبارات واضحہ واشارات لایحہ بیان نماید تا فایدۂ آن عام ونفع آن تام باشد''۔(عبدالواسع ہانسوی، ۱الف؛ بمد نسخۂ شیرانی)

مصنف نے اپنی تصنیف کی کمزوریوں کا خود ہی اعتراف کرلیا ہے کہ اسے نہ تو اس کام کے لیے زیادہ وقت ملا ہے اور نہ ہی کتب لغات وغیرہ میسر تھیں۔بس چند معتبر لغات اور ثقہ لوگوں سے جو کچھ اخذ کیا، جمع کر دیا:

''باوجود فقدان فرصت وعدم مساعدت وقت وبہم نرسیدن کتب لغات ومیسر نیامدن عبور وعثور بر شروح وفرہنجات، اسامی اشیاء ومعانی الفاظ را شطری از نسخ معتبرۂ لغات وبرخی از افواہ والسنہ ثقات اُخذ کردہ، درین اوراق معدودہ یکجا نمودہ آمد. چون عالم لغت واسع است واطلاع بر جمیع جزئیات غیر از خداوند علیم ممتنع، توقع از صاحبدلان باانصاف آن است کہ اگر در تحقیق اعراب یا تعین معنی مساہلہ رفتہ باشد، پیش از تصفح کتب لغات وتفحص از ثقات بہ تخطۂ پیش نیایند وآن را بر اختلاف لغت حمل نمودہ، زبان اعتراض نگشایند''۔(عبدالواسع ۱، الف وب)

اپنا اسلوب تصنیف بھی بتا دیا ہے کہ اس نے کتب لغات کی مروج ترتیب کے برخلاف، اپنی کتاب کو خود الفاظ کی بجاے ان کے معنی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔:

''از آنجا کہ مقصود از تسوید این اوراق بہم رسانیدن الفاظ است برای معنی، نہ فہمیدن معانی، برخلاف عامۂ کتب لغات، رعایت ترتیب در معانی کردہ شد تا پیدا کردن لفظ برای معانی برای ہر کس آسان باشد''۔(عبدالواسع، ۱ب)

اس کی تائید یوں ہوتی ہے کہ باب الف میں حسب ذیل تمام الفاظ، جو نباتاتی اشیاء ہیں، ایک ساتھ آئے ہیں: اسپرک، انبلی، اکھروٹ، آڑو، الاپچی، ادرک، اسپغول، اسگند، انبربیل، اندرجو، اونٹ کٹیلا، اجوائن، ایلوا، آک، ارہر، ارد۔

مصنف نے الفاظ کی ترتیب تہجی میں عوامی تلفظ کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ مثلاً ''خط زن'' بطور لفظ لکھ کر اس کی یوں وضاحت کی ہے کہ اصل میں ''قط زن'' ہے لیکن عوام ''خط زن'' کہتے ہیں اس لیے باب خاء میں رکھا گیا۔

غرائب کا سال تصنیف معلوم نہیں، لیکن مصنف کے عہد (گیارہویں صدی ہجری) کو پیش نظر رکھ کر، اسے اُردو کا پہلا فرہنگ قرار دیا گیا ہے (سید عبداللہ، مقدمہ، ص ۳) اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ لسانی اہمیت کے پیش نظر اردو زبان کا کوئی محقق اور طالب علم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا (وہی حوالہ)۔

بعض کتب اپنی حیثیت میں شاید زیادہ اہم اور مشہور نہ ہوں، لیکن انھیں کوئی اچھا نقاد میسر آجائے تو سب کی نظروں میں آجاتی ہیں اور زیر بحث رہتی ہیں۔ کچھ یہی معاملہ غرائب کے ساتھ ہوا۔ اسے سراج الدین علی خان آرزو جیسا نقاد مل گیا اور انھوں نے اس پر جو تنقید او راصلاح کی، اس کے ذریعے فارسی قلمرو والوں کو بالعموم اور اہل برصغیر کو بالخصوص فن لغت اور تنقید پر مزید ایک کتاب نوادر الالفاظ (اس کے بعد صرف ''نوادر'') کی شکل میں مل گئی اور دوسری طرف غرائب کا چرچا ہوا۔ آرزو نے نوادر اپنے ممدوح نواب یحییٰ خان کے نام معنون کی ہے۔ اس کی تاریخ تصنیف کا اظہار مقدمے میں تو نہیں ہوا، لیکن لفظ ''بیساکھ'' کے تحت لکھتے ہیں: ''امثال (کذا: امسال) کہ نوروز بست و چہارم محرم ۱۱۵۶ھ واقع شدہ'' (آرزو، ۹۶)۔ بعض نسخوں میں یہ سال ۱۱۹۶ھ درج بھی ہوا ہے جو ظاہر ہے غلط ہے (سید عبداللہ، ۹۶ حاشیہ)۔ ریحانہ خاتون نے ۱۱۶۵ھ لکھا ہے (ص ۱۲۴) جو ممکن ہے اعداد ۱۱۵۶ھ کی تقدیم و تاخیر ہو۔

غرائب کا اپنا مکمل متن تاحال شائع نہیں ہوا، لیکن جب **نوادر** کو ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۰۴-۱۹۸۶ء)، سابق پرنسپل و استاد شعبۂ اردو اورینٹل کالج، لاہور نے مرتب کیا اور اسے انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی نے ۱۹۵۱ء (اور تجدید طبع ۱۹۹۲ء) میں شایع کیا تو اس میں غرائب کی عبارتیں بھی داخل کر دیں۔

چاہیے تو یہ تھا کہ غرائب اور نوادر الگ الگ شایع ہوتیں، تاکہ دونوں کتابوں کی اپنی انفرادیت اور حیثیت برقرار رہتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ غرائب کو متن میں اور نوادر کو حاشیہ

میں رکھا جاتا۔لیکن سید عبداللہ نے نوادر (مشمولہ غرائب) کی تدوین کا ایک گنجلک طریقہ اختیار کیا جس کی وضاحت وہ خود یوں کرتے ہیں:

''میں نے اس متن میں غرائب اللغات کو شامل کرلیا ہے...غرائب کے الفاظ وتشریحات کو شامل کرنے کی صورت یہ اختیار کی ہے کہ پہلے خان آرزو کی عبارتوں میں اس کے اقتباسات کو واوین سے مقیّد کر دیا ہے، اس کے بعد ہر لفظ کی تشریح کے خاتمے پر نشان ( ) دے کر ان میں یا تو یہ نشان = دے دیا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ آرزو نے غرائب کا جو اقتباس دیا ہے وہ مکمل ہے۔اگر ناقص ہے تو جو کچھ کم وبیش ہے اس کو ( ) کے درمیان درج کر دیا ہے۔آرزو نے جو اضافے کیے ہیں ان کے خاتمے پر یہ نشان نہیں دیے''۔(سید عبداللہ، مقدمہ، ۴۴-۴۵، نیز دیکھیے: متن، ص ۵)

غرائب اللغات نسخہ کراچی: راقم السطور کو ۷۸-۱۹۷۹ء میں پاکستان کے قومی عجائب گھر، کراچی کے فارسی مخطوطات کی تفصیلی فہرست سازی کا موقع ملا۔اسی دوران شمارہ N.M.1957-975/3 کے تحت غرائب کا ایک ایسا نسخہ نظر سے گذرا جس پر جا بجا حاشیے ہیں اور ہر حاشیے کے آخر میں ''آرزو'' لکھا ہے۔اس کی صراحت نسخے کے کاتب نے ترقیمے میں یوں کی ہے:

''بہ اتمام رسید و بہ اختتام انجامید نسخۂ غریب واجزای عجیب مسمی بہ غرائب اللغات، بہ روز شنبہ، بہ تاریخ پنجم رمضان المبارک ۱۲۳۸ ہجری مطابق شانزدہم مئی ۱۸۲۳ عیسوی از نسخہ (ای) کہ خان مرحوم سراج الدین علی خان آرزو ملاحظہ فرمودہ، حاشیۂ آن بہ دست خود نوشتہ وصحیح کردہ بود، نقل گرفتہ شد''۔

میں ۱۹۸۸ء میں دہلی گیا تو وہاں اردو ادب کے معروف محقق رشید حسن خان (۱۹۳۰-۲۰۰۶ء) نے مجھ سے غرائب (نسخۂ کراچی) کی عکسی نقل طلب کی جو انھیں اسی سال مہیا کر دی گئی۔غالباً اسی زمانے سے یا شاید پہلے سے انھیں غرائب کی تدوین کا خیال تھا اور وہ اس کے لیے لازمی مواد اور دیگر نسخوں کے عکس حاصل کر رہے تھے۔گیارہ سال بعد بھی وہ اس کی تدوین کی فکر میں تھے، ۴ اگست ۱۹۹۹ء کو وہ اپنے ایک خط بنام ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب (اسلام آباد) میں اس کا

اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں پچھلے کئی سال سے سحرالبیان کی تدوین میں الجھا ہوا ہوں، اس کے بعد غرائب اللغات (عبدالواسع ہانسوی) مرتب کرنے کا ارادہ ہے، اگر عمر اور صحت نے وفا کی۔'' (گوہر نوشاہی، ۴۵)

لیکن کئی سال گذر گئے، غرائب پر خان صاحب کا کام سامنے نہ آ سکا۔ اپنی وفات سے کوئی چار ماہ پہلے تک وہ اس کی ترتیب میں لگے ہوئے تھے، جیسا کہ ۱۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو شاہ جہان پور سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کے نام ایک مکتوب میں اظہار کرتے ہیں:

''آج کل غرائب اللغات کو مرتب کرنے میں لگا ہوں۔ یہ اردو کا پہلا لغت ہے۔ نوادرالالفاظ، جو اسی پر مبنی ہے، چھپ گئی، مگر یہ اصل کتاب اب تک نہیں چھپ سکی تھی۔ اب چاہتا ہوں کہ اس کا متن مرتب کر کے معرض طبع میں آ جائے۔ مولانا عبدالواسع کی محنت کیوں ضایع ہو؟ خان آرزو اور پھر ڈاکٹر سید عبداللہ نے ہانسوی کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ دیکھیے کب تک مکمل کر پاتا ہوں۔ اَسی برس کے بعد آدمی بڑی حد تک سست قدم ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی وہی احوال ہے''۔ (گوہر نوشاہی، ۴۶)

اس کے ایک ماہ بعد ہی انھوں نے غرائب کی تدوین کا منصوبہ یکا یک ترک کر دیا۔ وجہ بڑی غریب ہوئی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی صاحب کے ایک خط کے جواب میں شاہ جہان پور سے ۱۸/نومبر ۲۰۰۵ء کو لکھتے ہیں:

''یہ مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ برادرم عارف نوشاہی بھی غرائب اللغات کو مرتب کر رہے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔ میں نے اب اس کام کو نہ کرنے کا قطعی طور پر فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اس بستے کو باندھ کر حوالۂ طاق نسیان کر دیا ہے۔ اس سے متعلق ایک مختصر سا تعارفی مضمون ایک رسالے کو بھیجا تھا، اس کے چھپنے میں وقت لگے گا۔ (۳) اس کے آخر میں میں نے لکھا تھا کہ میں اسے مرتب کر رہا ہوں، آج ہی اڈیٹر کو ضروری خط لکھا ہے کہ اس آخری

پیرا گراف کو نکال دیا جائے۔ دیکھیے بھائی! کام کرنے کے بہت ہیں اور وقت کم رہ گیا ہے۔ ایسے میں ایک ہی کام کو دو آدمی کریں گے تو فائدہ کچھ نہ ہوگا۔ اچھا یہ ہوگا اس مدت میں دو آدمی دو کام کریں، اس سے فائدہ ہوگا۔ عارف صاحب اس کام کو مجھ سے بہتر انجام دیں گے، اس لیے میں کل سے ایک اور کام کا ڈول ڈالوں گا۔ میرے پاس غرائب کے خطی نسخوں کے جو عکس ہیں ان میں آزاد لائبریری علی گڑھ ذخیرۂ شروانی کا نسخہ نسبتاً بہتر ہے، اگر وہ وہاں نہ ہو تو لکھیے میں اس عکس کو فوری طور پر بھیج دوں گا۔ میرے علم میں اس کا ایک نسخہ ذخیرۂ اشپرنگر جرمنی میں بھی ہے۔ میں نے اس کا عکس حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناکام رہا۔ معلوم نہیں کیسا نسخہ ہے۔'' (گوہر نوشاہی، ۴۷-۴۸)

اس پر مکتوب الیہ نے جو توضیحی حاشیہ لکھا اس کے بعض متعلقہ حصے یہ ہیں:

''پروفیسر رشید حسن خان کے مکتوب مورخہ ۱۱/۱۱ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے جواب میں یہ عرض بھی کیا تھا کہ عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات پر ڈاکٹر عارف نوشاہی کام کر رہے ہیں اور یہ کام تکمیل کے نزدیک ہے۔ چنانچہ خان صاحب نے عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات پر بلند ہمتی اور کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی تدوین سے دستبرداری کا اعلان کیا میرے خیال میں میرا خان صاحب کو اس امر پر متوجہ کرنا اور خان صاحب کا قطعی طور پر فیصلہ کرنا دونوں سہو و خطا پر مبنی تھے۔ مجھے اگر اندازہ ہوتا کہ خان صاحب اس قدر انتہا پسندی کا مظاہرہ کریں گے تو میں یہ بات ان کے علم میں نہ لاتا اور خان صاحب کو نہیں چاہیے تھا کہ اپنی محنت کو ضایع کر دیتے۔ میرے خیال میں اگر دونوں محققین کے نسخے منظر عام پر آجاتے تو یہ علمی اور ادبی اعتبار سے زیادہ بہتر اور سود مند ہوتا''۔ (گوہر نوشاہی، ۵۴)

اس خط میں میری طرف سے غرائب کی تدوین کی جو بات درمیان میں آئی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے ۱۹۸۸ء میں رشید حسن خان مرحوم کو غرائب (نسخۂ کراچی) کا عکس فراہم کیا تھا، لیکن پندرہ سال گذر جانے پر بھی جب ان کی طرف سے غرائب کی تدوین کی کوئی خبر نہ آئی تو میں

نے نسخۂ کراچی کو، جس کا ایک عکس میرے پاس بھی ہے، صاف خط میں لکھنا شروع کیا۔ نقل کا طریقہ یہ رکھا کہ اوپر غرائب کا متن دیا اور پاورقی میں آرزو کا حاشیہ نقل کیا۔ مزید سہولت کے لیے نوادر (مطبوعہ) کے صفحے کا بھی حوالہ دے دیا۔ یہ نقل ابتدا سے لے کر ''باب الراء'' کے لفظ ''رتوندھا'' تک تیار ہو چکی تھی کہ درمیان میں روک دی، وجہ یہ ہوئی کہ نسخۂ کراچی کی جو عکسی نقل میرے پاس تھی اس میں آرزو کے حواشی تصویر کے فریم میں پوری طرح نہیں آئے تھے اور ظاہر ہے ناقص حواشی نقل کرنے سے غرائب کی تدوین کا مقصد فوت ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کراچی کا سفر کیا اور میوزیم میں نسخہ دیکھا۔ ارادہ یہ تھا کہ عکسی نقل کے ناقص حصے ہاتھ سے لکھ کر مکمل کر لوں گا، لیکن یہ کام کراچی میں کئی روزہ قیام کا متقاضی تھا جو میرے لیے ناممکن تھا اور یوں یہ کام وہیں رُک گیا اور اب تک نامکمل پڑا ہے۔

میری اس نقل نویسی کی اطلاع گوہر نوشاہی صاحب کو تھی۔ انھوں نے از خود اسے ''میرے کام کرنے اور تکمیل کے قریب ہونے'' سے تعبیر کیا اور بات رشید حسن خان صاحب تک پہنچادی اور انھوں نے دل برداشتہ ہو کر اپنا اُس وقت تک کیا ہوا کام ایک طرف رکھ دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ خان صاحب مرحوم نے گوہر نوشاہی صاحب سے ایک ادھوری اطلاع پا کر اپنا سال ہا سال کا منصوبہ ترک کر دیا اور اردو و فارسی ادب کو تدوینِ متن کی ایک عمدہ مثال سے محروم رکھا۔ میں ان کے لیے بیگانہ نہ تھا، کاش مجھ سے ہی صورت حال پوچھ لیتے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ ۲۰۰۵ء میں جس مخدوش صحت کے مالک تھے اب ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ پتّا مار کر کام کرتے اور انھوں نے اسے ترک کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ اب افسوس ناک صورت یہ ہے کہ نہ خان صاحب کا کام پورا ہوا، نہ میرا۔ غرائب کی تدوین و طباعت اب کسی اور مردِ میدان کی منتظر ہے۔

نسخۂ کراچی میں غرائب پر آرزو کے حواشی مطبوعہ نوادر سے دو اعتبار سے مختلف ہیں۔ پہلا نسخۂ کراچی میں غرائب کے صرف چند الفاظ پر حاشیہ آرائی کی گئی ہے جب کہ نوادر کا ذخیرۂ الفاظ کہیں وسیع تر ہے۔ دوسرا، نسخۂ کراچی کے حواشی اور نوادر کی عبارتوں میں کچھ فرق ہے۔ یہ اختلاف کہیں اختصار کی شکل میں ہے اور کہیں لفظی اختلاف کی شکل میں۔ قیاس کہتا ہے کہ جب آرزو نے پہلی بار غرائب کا نسخہ دیکھا ہوگا تو دوران مطالعہ اپنے علمی استحضار کی بنا پر کچھ حواشی لکھ دیے ہوں گے۔ بعد میں مزید تحقیق کر کے ان حواشی کو نوادر الالفاظ کی شکل میں پیش کیا۔ نسخۂ کراچی کے ترقیمہ

سے واضح ہے کہ کاتب کے پیش نظر غرائب کا ایسا نسخہ (منقول عنہ) تھا جس پر آرزو کے اپنے قلم سے حواشی تھے اور یہ یقیناً غرائب کا وہی نسخہ ہوگا جو آرزو کے زیر مطالعہ رہا اور اس نے قلم برداشتہ اپنے حاشیے لکھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا، نسخۂ کراچی کے حواشی اور نوادر میں کچھ اختلاف ہے۔ بے شک یہ اختلافات، آرزو کے بنیادی خیالات کو، جو نوادر میں حتمی شکل میں بیان ہوئے ہیں، چنداں متاثر نہیں کرتے، پھر بھی غرائب کی تدوین کے وقت یہ ابتدائی حواشی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ دوسری طرف نسخۂ کراچی کے حواشی، آرزو کی غرائب پر اختلافی آراء کی تدریجی اور ارتقائی شکل کو بھی واضح کرتے ہیں۔ زیر نظر مقالے کا مقصد بھی یہی ہے کہ محققین کو اس جانب متوجہ کیا جائے۔ یہاں نسخۂ کراچی سے چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے جن کا تقابل قارئین نوادر میں درج آرزو کی آراء سے خود کر سکتے ہیں۔ ہر مثال کے بعد نسخۂ کراچی کا ورق شمار اور تقابل کی سہولت کے لیے مطبوعہ نوادر کا صفحہ شمار دیا گیا ہے۔ عبارتیں نسخۂ کراچی سے منقول ہیں۔

الائچی: ''الائچی دو قسم است جیل، الائچی خُرد را می گویند. و الائچی لفظ ہندی است و احتمال تفرس دارد و احتمال توافق لسانین نیز است. وقاقلہ صمغد (؟) کبار (را) خوانند''۔ (ورق ۵ ب/نوادر، ۳۳)

اندرسا: ''زلیبا ہمان است کہ بہ ہندی جلیبی خوانند و چون زاء معجمہ در ہندی نیست، زلیبا را جلیبی گویند و آن غیر اندرسہ است''۔ (ورق ۵ الف/نوادر، ۴۲)

انگاکڑا: ''سکالبو در فارسی چیزی است کہ آن را بر انگشت پختہ باشند، خواہ نان وخواہ طعام، پس غیر انگاکڑا باشد''۔ (ورق ۵ ب/نوادر میں آرزو کے حاشیے کے بغیر ہے)

انگیا: ''دشی بعضی گویند کہ پوستین است و بعضی گویند مطلق جامہ ای کہ شب بپوشند۔ معلوم نیست کہ مؤلف بہ معنی انگیا، کہ پوشاک ہندوزنان است، از کجا نوشتہ''؟ (ورق ۴ ب/نوادر، ۴۱)

سید عبداللہ کے شایع کردہ نوادر کے متن میں مادّہ ''پنیری'' نہیں ملتا۔ لیکن غرائب کے نسخۂ کراچی (نیز نسخۂ شیرانی) میں یہ موجود ہے اور اس پر آرزو کا حاشیہ بھی ہے:

پنیری: ''آن کہ شاخ ہای درختان را در زمینی فرو برند تا سبز شود و از آنجا بہ جایی دیگر نقل

کنند۔ ''نخیز' بانون وخاء معجمہ وزاء معجمہ بروزن فقیر۔وآن زمین راتخمہ ان ودار دان (گویند)''۔

آرزو: ''نخیز درنسخۂ وفایی (۴) بہ معنی تخمدان گفتہ وآن جایی است کہ چیزی درآن کارند وازآنجا کندہ (بہ) جای دیگر بھتال کنند۔ پس قول مصنف کہ پنیری نخیز است،غلط باشد، چہ پنیری آن نہالان راگویند کہ از جایی بہ جایی دیگر کارند۔ باآنکہ سروری می گوید کہ صاحب نسخۂ وفایی ازین حول مفرداتست (؟) بلکہ شاخ ہای مذکور راپنیری نخوانند ''قلم'' گویند در ہندوستان ہم''۔(۱۱۹الف)

پیوند: ''پرَوَز در کتب معتبرۂ لغت بہ معنی فراویز جامہ است کہ بہ عربی سنجاف خوانند نہ بہ معنی پیوند. وتحقیق ہمین است؛ چراکہ پروز مخفف پراویز است وفراویز مبدّل آن است وفارسی صحیح آن ''پنہ'' است؛ بلکہ پیوند خود فارسی است.'' (۱۱۴الف/نوادر،۱۳۵)

آرزو نے نسخۂ غرائب کے مطالعہ کے دوران حواشی لکھے اور بعد میں مزید تحقیق کے بعد نوادر میں جو اضافے کیے، اس کی ایک مثال مادّہ ''بڑ'' پر نسخۂ کراچی میں موجود آرزو کا حاشیہ ہے۔اُس وقت آرزو کے ذہن میں صرف ایک مثال (منیر لاہوری کا مصرع) تھی۔لیکن نوادر لکھتے وقت آرزو نے الفاظ الادویہ اور عبداللہ وحدت کے ایک شعر سے مزید شواہد تلاش کر لیے اور توافق لسانین کی مثال بھی پیش کی۔

بڑ: ''درخت بڑ مخصوص ہندوستان است وکسی فارسی او نیاوردہ، چنانچہ منیر گفتہ: درختی کہ خود بر بود کس ندیدہ''۔(۱۲ب/نوادر،۷۲)

جھینگر: ''جانور مذکور بہ فارسی ''چرواسک'' یا ''چراسک'' بہ حذف واواست. وآن را بہ عربی ''صرّار'' باصاد وتشدید راء گویند لیکن ''جنجر'' در کتب لغت دیدہ نشد''۔(۱۲۶الف/نوادر،۱۸۷)

چھتری: ''چھتری لفظ عام است کہ بر نشیمن کبوتران وغیرہ اطلاق کنند وآن شبکہ دار باشد ولھذا دستار ہندی الاصل را ''بال چھتری'' گویند ودراصل بال چھتری چتری می باشد، از چوب یا نی شبکہ دار کہ حلقہ ہا درآن بستہ، جانوران را شکار کنند وجفتی کہ زیر تاک انگور سازند، نشنید کہ آن را چھتری گویند ونیز برای بیارۂ کدو وخیار در ہند چھتری ساختن رسم نیست. بہر حال چھتری وبرم یکی نیست''۔(ورق ۲۸ب/نوادر،۱۹۸)

چکئی: ''فرنگ بہ کسر وفتح نون، در شیرازی وغیرہ چوبکی کہ اطفال بر زمین گردانند وفرفرہ نیز

خوانند۔لیکن فرفرہ چیزی (است) کہ اطفال ریسمان درآن انداختہ، بگردانند، بعد ازآن درکشاکش آرند وآوازی ازآن برآید .وصاحب برھان ''فرفرہ بادزن وکاغذ پارہ ای کہ اطفال بر چوبی تعبیہ کردہ بہ دست گیرند وروبہ باد بایستند تا بادآن را بگرداند'' برآوردہ۔ برین تقدیر غیر چکئی باشد ومی توان گفت کہ ''فرنگ'' بہ معنی مطلق بازیچۂ اطفال است کہ ریسمانی بدان بستہ گردانند۔ دراین صورت اطلاق آن برلٹو وچکئی وپھرکی، کہ ہرسہ بازیچۂ اطفال است، صحیح باشد''۔(۲۹ب/نوادر، ۲۰۷)

چودھری: ''سابق چودھری بہ معنی کلانترِ دِہ وبازار ومحلّہ گفتہ، و''کلو'' مترادف آن آوردہ ودراینجا باآن کہ مکرر است، بمعنی کلانترِ دِہ گفتہ .وتحقیق آن است کہ ''کلو'' زبانِ شیراز است و ''کیا'' با کاف تازی بہ معنی مطلق بادشاہ است ودر گیلان وطبرستان ''مرزبان'' و''دہاقین'' را کیا خوانند از جہت تعظیم .پس ''دہ کیا'' بمعنی خداوند دِہ باشد۔ وقوسی گوید'' در گیلان متعارف است کہ سادات را کیا وبادشاہ را کارکیا خوانند''۔(ورق ۳۰ب/نوادر، ۲۱۷)

نوادرالالفاظ سید عبداللہ اشاعت کے تسامحات: غرائب (نسخۂ کراچی) کو نقل کرتے وقت میں برابر نوادر (سید عبداللہ اشاعت) سے رجوع کرتا رہا اور اس سے مدد لیتا رہا۔جیسا کے سید عبداللہ نے اپنے مقدمے میں بتایا ہے کہ انھوں نے غرائب اور نوادر کے چند قلمی نسخوں کی مدد سے یہ اشاعت تیار کی ہے۔مجموعی طور پر یہ ایک علمی اور تحقیقی اشاعت ہے .اس کے باوجود اس اشاعت میں متن خوانی اور پروف خوانی کی کچھ اغلاط مجھے نسخۂ کراچی سے تقابل کے دوران نظر آئیں جس کا ذکر یہاں کرتا ہوں شاید آیندہ غرائب یا نوادر پر کام کرنے والوں کے لیے فائدہ مند ہو:

صفحہ/سطر	غلط	صحیح
۱۶/ ۷	گوشت خوردن	گوشت خورد
۲/۲۵	رسن اسپان کہ پیش ہا کنند	......پیش رہا کنند
۱۳/۴۲	خستہ ہای اوسیاہ بود	ھستہ ہای اوسیاہ بود
۶/۸۳	ازمیوہ وشیر پرکردہ	زمیوہ وشیرینی پرکردہ
۳/۱۱۴	شکبہ	شبکہ
۵/۱۲۳	اکثر درورقی است	اکثر دروقتی است

۸/۱۳۷	تپرک بوزن زیرک	تیرک بوزن زیرک
۱۰/۱۴۴	نعا کچہ	مغا کچہ
۱۴/۱۶۲	پوستی کہ قلندران...... بندند	پوششی کہ قلندران...... بندند
۱۵/۱۶۲	برہاے آسیا	پرہہاے آسیا
۳/۱۸۳	خانۂ مخفی	خانۂ محقر
۲-۱/۱۹۰	باب الجیم الفارسیہ (ج)	باب الجیم الفارسیہ (چ)
۲/۱۹۳	از پارچہ نماند	از پارچہ بماند
۱۵/۱۹۹	سراج الدین ارجی	سراج الدین سراجی
۲/۲۰۲	زیرزنار بالای ران	زیرزہار بالای ران
۲۶/۲۲۴	داخل جہاز وجز آن کنند	داخل جہیز دختران کنند

یہاں ان محققین کی سہولت کے لیے جو غرائب اور نوادر مرتب کرنا چاہتے ہوں، ان دونوں کتب کے معلومہ قلمی نسخوں کی ایک مجمل اور نامکمل فہرست دی جاتی ہے۔

غرائب اللغات کے مخطوطات (تاریخ وار): پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ذخیرۂ شیرانی 4469/1419 ، مکتوبہ ۲۹ جلوس محمد شاہی (مطابق ۱۱۶۰ھ) / چیت ۱۸۰۴ بکرمی ، در دارالخلافہ شاہجہان آباد، من مقام دہلی کہنہ، کاتب ہندو ہے اور قوم کایتھ ماتھر سے تعلق رکھتا ہے، وہ اس وقت حاجی فولاد خان کوتوال شاہجہان آباد کی ملازمت میں تھا، خط شکستہ، ۴۳ ورق، اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کاتب نے بعض مادوں کو فارسی رسم الخط کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھا ہے۔ مثلاً پکھال، پہچی ، پھوس وغیرہ ، یہ نسخہ سیّد عبداللہ نے استعمال کیا تھا۔ راقم السطور نے بھی دیکھا ہے۔

رام پور رضا لائبریری، کتاب نمبر ۲۵۴۳، کتب خانہ شیلف ۵۱۰۹م، مکتوبہ ۱۲۰۵ھ، ۵۶ ورق۔

ہر دیال پبلک لائبریری، دہلی، نمبر ۶۲۷، مکتوبہ ۱۲۰۹ھ، بقلم جے رام داس، ۵۲ ورق۔
فہرست نسخہ ہای خطی فارسی کتابخانۂ ندوۃ العلما، لکھنو (دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۶۱۸-۶۱۹)

میں غرائب اللغات کے تحت دونسخوں کا اندراج ہوا ہے۔ پہلے نسخے کے بارے میں تو یقین ہے کہ وہ نوادر ہے اور فہرست نویس کو سہو ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ (شیلف ۱) مکتوبہ ۱۲۲۰ھ، بدست مقصود علی چھپتا پور ہے۔ فہرست میں بتایا گیا ہے کہ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

احیای دل مردہ نماید در دم
یحیی است کہ اعجاز مسیحا با اوست

مگر غرائب نہ اس شعر سے شروع ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے اندر ایسا کوئی شعر ہے! شاید فہرست نویس کو یہاں بھی سہو ہوا ہے۔

نیشنل میوزیم، کراچی، N.M.1957-975/3، مکتوبہ ۱۲۳۸ھ، یہ قدرے مغلوط نسخہ ہے۔

پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم، لاہور، نمبر 297/85، مکتوبہ ۱۲۶۰ھ؛ پروفیسر شفیع کا کتب خانہ ان کی وفات کے بعد منتشر ہوگیا۔

رام پور رضا لائبریری، کتاب نمبر ۲۵۴۴، شیلف ۵۱۱۰م، مکتوبہ ۱۲۸۱ھ، بدست سید جعفر شاہ واثق بخاری، بحکم نواب خلد آشیان (؟)، ۵۴ ورق۔

طاہر شاہین مرحوم، بھکر، مکتوبہ ۱۲۸۹ھ۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ذخیرۂ شیرانی، 4377/1326، مکتوبہ ۱۳۵۱ھ۔

حسب ذیل نسخے بلا تاریخ ہیں: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ حبیب گنج، نمبر H.G. 53/23، ۶۶ ورق (اس کی مائکروفلم، نور مائکروفلم سنٹر، دہلی، نمبر 90/3 میں ہے) پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم، لاہور، نمبر 308/89

انجمن ترقی اردو، کراچی، نمبر ۳ قف ۳۳۲، عشرت علی خان کے مقدمہ بزبان اردو کے ساتھ۔ سید عبداللہ نے استعمال کیا تھا۔

نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد، ذخیرۂ مفتی فضل عظیم، نمبر زبان شناسی ۸۲، ناقص الآخر، حرف میم تک، ۵۸ ورق (نوشاہی، فہرست، ۵۴۲) رام پور رضا لائبریری، کتاب نمبر ۲۴۷۹، ورق ۹ تا ۵۷۔

مسعود حسن رضوی (لکھنو)، اس نسخے سے سید عبداللہ نے فائدہ اٹھایا تھا لیکن اس کی

تفصیل نہیں دی (مقدمہ، ص، ۴۴)

ہر دیال پبلک لائبریری، دہلی، نمبر R332، کرم خوردہ، ناقص الآخر، ۵۷ ورق۔

نوادر الالفاظ کے مخطوطات (تاریخ وار): رام پور رضا لائبریری، کتاب نمبر ۲۵۴۵، شیلف نمبر ۵۱۰۸م، مکتوبہ ۱۱۵۶ھ، ۳۱۶ ورق۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ حبیب گنج، نمبر H.G.53/42، تاریخ کتابت ۱۱۵۷ھ ۱۳۳ ورق (اس کی مائکروفلم، نور مائکروفلم سنٹر، دہلی، نمبر 38/5 میں موجود ہے)۔

انجمن ترقی اردو، کراچی، نمبر ۳ قف ۳۴۴، مکتوبہ از دست میر شکر اللہ، ۱۱۶۳ھ، سیّد عبداللہ نے استعمال کیا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی کلیکشن، نمبر: یونیورسٹی ضمیمہ ۶ فارسی لغات، تاریخ کتابت ۱۲۲۸ھ ''سنہ ثمان وعشرون ومائتین والف''، مقام کتابت مارہرہ، ۱۰۶ ورق۔

جامعۂ ملیہ اسلامیہ، دہلی، نمبر C335، مکتوبہ ۱۲۳۰ھ، کرم خوردہ، ۹۰ ورق۔

ندوۃ العلماء، لکھنو، شیلف ۵، مکتوبہ ۱۲۳۴ھ، ابتدا سے ناقص ہے اور لفظ ''آوا'' سے شروع ہوتا ہے۔ ۲۸۲ صفحات۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور، Ap II، مکتوبہ ۱۲۳۷ھ، اس کے حاشیے پر محمد محسن نے کچھ اضافے کیے ہیں۔ سید عبداللہ کا گمان ہے کہ یہ شخص، آرزو کا عزیز اور محاکمات الشعراء کا مصنف ہے۔ یہ گمان درست ہونے میں مجھے اس لیے شک ہے کہ خود سید عبداللہ نے اپنے مجموعۂ مقالات فارسی زبان وادب (لاہور، ۱۹۷۷ء ص ۱۵۰) میں محاکمات کا سال تصنیف ۱۱۸۰ھ لکھا ہے۔ زیر بحث نسخۂ غرائب کا سال کتابت ۱۲۳۷ھ بتایا گیا ہے۔ ان دونوں تاریخوں میں ۵۷ سال کا بعد ہے۔ بعید معلوم ہوتا ہے کہ میر محمد محسن اکبرآبادی جنھوں نے محاکمات اپنی پختہ عمر میں لکھی ہوگی، ایک طویل عمر پا کر ۱۲۳۷ھ تک بقید حیات ہوں۔

رام پور رضا لائبریری، کتاب نمبر ۲۵۴۷، شیلف نمبر ۶۸۲۰م، مکتوبہ ۱۲۴۸ھ، ۱۴۵ ورق۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ذخیرۂ شیرانی، 4468/1418، مکتوبہ ۱۲۴۸ھ، سید عبداللہ نے استعمال کیا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یونیورسٹی کلیکشن، نمبر: فارسیہ (۵) لغات ۲۰، ۱۲۵۶ھ ، نام کاتب ندارد، ۱۸۵ ورق۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ قطب الدین، نمبر 118/4 لغات وفرہنگ فارسی، ۱۲۱ ورق، سرورق پر ۱۲۷۱ھ کی یادداشت مرقوم ہے۔ جابجا حاشیے پر مزید نئے الفاظ اوران کے معنی لکھے گئے ہیں مثلاً ''آٹے کی چڑیا''، ''آٹے کا پیڑا''، ''انڈا''، ''انڈے کی زردی''، ''ایندھن''، ''بھٹ'' (خانۂ جانوران صحرائی......)، ''بچھو''، بچھو کا ڈنک'' وغیرہ۔

نیشنل آرکائیوز، دہلی (ذخیرۂ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ)، نمبر ۴۳۲، شیلف ۱۰۶، مکتوبہ (۱۲۹۳ھ) ۱۸۷۶ء، کاتب محمد امجد، ہنری بلاخمان نے یہ نسخہ لکھوایا تھا؛ ۳۷۴ صفحات۔

ذخیرۂ احسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نمبر 891.5529/1 ف لغات، کاتب سید علی ابراہیم المتخلص بہ خلیل کانپوری، ۱۳۴۵ھ، ۸۸ ورق۔ یہ نسخہ یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۶ سے نقل کردہ ہے۔ کاتب کم سواد ہے۔ بعد میں کسی نے دیگر نسخے سے اس کا مقابلہ کیا۔ چھوٹے ہوئے الفاظ وجملوں کا اضافہ کیا ہے اور جابجا بلغ بھی لکھا ہے۔ اپنا ترقیمہ لکھنے کے بعد آخر میں کاتب نے اصل نسخے کا ترقیمہ بھی نقل کیا ہے جو بعینہ یونیورسٹی ضمیمہ نمبر ۶ کا ترقیمہ ہے۔

بلا تاریخ نسخے: انجمن ترقی اردو، کراچی، نمبر ۳ ق ف ۳۴۵۔

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کول کتہ، نمبر 344 III، آرزو کے ایک مجموعہ رسائل (بلا تاریخ) میں، ورق ۹۸-۴۴، Ivanow,IISup,p.28,274 نے اسے غلطی سے غرائب اللغات کے نام سے درج کیا ہے لیکن مقدمہ کی عبارت سے معلوم ہے کہ یہ نوادر کا نسخہ ہے۔

رام پور رضا لائبریری، کتاب نمبر ۲۵۴۶، شیلف نمبر ۱۱۱۵م، ۱۱۷ ورق۔

رام پور رضا لائبریری، نمبر نہیں دیا گیا، ورق ۵۸ تا ۱۵۹۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ سبحان اللہ، نمبر 891.5529/13، ۱۹۸ ورق (اس کی مائکروفلم، نور مائکروفلم سنٹر، دہلی، نمبر 322/1 میں ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ذخیرۂ سبحان اللہ، نمبر 891.5529/18، ۱۷۱ ورق، ناقص الآخر نسخہ ہے، لفظ ''کنڈا'' تک اندراج ہے۔ (اس کی مائکروفلم، نور مائکروفلم سنٹر، دہلی، نمبر 324/2 میں موجود ہے)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جواہر کلکشن، نمبر ۱۳۵، ۱۲۸ ورق، مکمل نسخہ لیکن نام کاتب وسنہ کتابت نہیں ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جواہر کلکشن، نمبر ۱۳۶، ۸۷ ورق، ناقص الطرفین: ''توری'' سے ''لاٹھی'' تک۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ذخیرۂ شیرانی، 3489/465، ناقص۔

پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 1161/Pi II 55، سید عبداللہ نے استعمال کیا تھا۔

مولوی محمد شفیع مرحوم، لاہور، سید عبداللہ نے استعمال کیا تھا۔

کتاب خانۂ مجلس شورای اسلامی، تہران، نمبر 13851

چند اور غرائب اللغات؟ فہرست مخطوطات امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنو، ص ۲۲ میں ایک اندراج اس طرح ہوا ہے:

غرائب الغت (کذا) مصنف عبداللطیف، فن: لغت ہندی فارسی، صفحۂ اول:

سرنامہ راسایۂ بال ہماست وظل تو جہاتش، ۳۰۸ ص، Acc.No. 48351

سندھی زبان کی ایک فرہنگ، غریب اللغات مصنف بھیرومل مہر چند، ۱۹۰۷ء میں شایع ہوئی۔

غرائب اور نوادر پر مزید مباحث کے لیے مواد: حافظ محمود شیرانی، مقالات شیرانی، ج ۹، ص ۴۳۱۔ ریحانہ خاتون، احوال و آثار سراج الدین علی خان آرزو، ص ۱۲۳۔ سید عبداللہ، ''غرائب اللغات میر عبدالواسع ہانسوی''، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۵۰ء، ج ۲۷، ش ۱، عدد مسلسل ۱۰۳، ص ۱۴-۲۳ (کم و بیش یہ مقالہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نوادر پر مقدمہ میں آ گیا ہے)۔

سید عبداللہ، ''اردو کا دوسرا قدیم لغت نگار سراج الدین علی خان آرزو''، مباحث، ۱۹۶۵ء، ص ۳۲-۶۹۔

حواشی

(۱) گارسین دتاسی نے اپنی تاریخ: *Histoire de la Hindouee et Hindoustane*، جلد اول، مطبوعہ پیرس ۱۸۷۰ء، میں ہانسوی کی لغت پر یہ شذرہ لکھا ہے: ترجمہ از لیلیان سیکستین نازرو، زیر طبع (کراچی)

''عبدالواسع ہانسوی ایک ہندی لغت کے مصنف ہیں جس کا Breton نے طبی لغت میں حوالہ دیا ہے اور اسے ہانسوی کے نام سے پکارتے ہیں۔ دراصل لغت کا نام ''غرائب اللغات'' ہے۔ ایک مختصر قواعد فارسی بہ نام ''رسالہ عبدالواسع'' مطبوعہ کان پور سنہ ۱۸۵۱ء مطبع مصطفائی نے اسے شائع کیا ہے جو پریس کے مالک مصطفیٰ خان کے نام سے منسوب ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کتاب فارسی میں ہے۔

شیفتہ نے اس نام کے ایک ہندوستانی شاعر کا ذکر اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ میرے خیال میں وہ یہی مصنف ہیں۔

(ہانسی ایک شہر کا نام ہے۔ یہ صوبہ دہلی میں فیروز شاہ کی نہر پر ۲۸ درجہ ۵۲ دقیقہ شمالی عرض البلد اور ۷۵ درجہ ۳۹ دقیقہ مشرقی طول البلد پر واقع ہے۔ اسے مسلمانوں نے غزنوی عہد میں ۱۰۳۵ھ میں فتح کیا تھا اور ۱۸ویں صدی کے آخر میں ایک یورپین قسمت آزما Georges Thomas نے اسے اپنی توجہ کا مرکز بنا کر اپنا مستقر بنایا تھا۔ دیکھیے (East India Gazette. Hamilton) جلد نمبر ا، ص ۶۲۹)

گارسین دتاسی کا یہ شذرہ ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب (کراچی) نے فراہم کیا جس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔ گارسین دتاسی کی تاریخ کے مذکورہ اردو ترجمے کی اشاعت کا وہی بندوبست کر رہے ہیں۔

(۲) سکندر نامہ بری نظامی گنجوی مطبوعہ ۱۳۲۳ھ کے حواشی میں ایک کتاب جوہر تحسین مؤلفہ عبدالواسع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں یہ عبدالواسع کون ہیں؟

(۳) رشید حسن خان مرحوم کا غرائب پر یہ مقالہ کہاں چھپا؟ چھپا بھی یا نہیں؟ کچھ معلوم نہیں ہے۔ معتبر ہندوستانی اردو رسائل: آجکل، اردو ادب، ایوان اردو، خدابخش لائبریری جرنل، فکر و تحقیق، غالب نامہ، معارف، ہماری زبان کی ۲۰۰۵ء اور ۲۰۰۶ء کی اشاعتیں دیکھ لی ہیں، کم از کم ان دو برسوں میں تو یہ مقالہ نہیں چھپا۔ اس تلاش کے لیے میں ڈاکٹر عطا خورشید صاحب کا رہین منت ہوں۔

(۴) نسخۂ وفائی سے مراد حسین وفائی کی فرہنگ فارسی ہے جو تہران یونیورسٹی سے ۱۳۷۴شمسی/ ۱۹۹۵ء میں شایع ہوچکی ہے۔ اسے پیکنگ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی تن ہوی جو (Teng Huizhu) نے مرتب کیا ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰۱ پر یہ لفظ ''نخیز'' لکھا ہے اور تشریح یوں کی گئی ہے: ''دو معنی دارد؛ اول موضع را گویند کہ درخت در آن کشتہ باشند. در شیراز تخم دان و داردان گویند۔ دوم کمین گاہ باشد۔ عسجدی گفتہ؛ بیت:

یکی اژدہای دمندہ تو بادی
یکی از نخیزی خزندہ چو ماری''

کتابیات

آرزو، سراج الدین علی خان، نوادر الالفاظ، مرتّبہ سیّد عبداللہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء طبع دوم۔
ریحانہ خاتون: احوال و آثار سراج الدین علی خان آرزو، انڈو پرشین سوسائیٹی، دہلی، ۱۹۸۷ء۔
رحیم پور، مہدی: برخوان آرزو، مجمع ذخائر اسلامی، قم، ۱۳۹۱ش/ ۲۰۱۲ء۔
سید عبداللہ: مقدمہ نوادر الالفاظ تصنیف سراج الدین علی خان آرزو، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء طبع دوم۔
عبدالواسع ہانسوی، غرائب اللغات مع حواشی سراج الدین علی خان آرزو، مخطوطہ نیشنل میوزیم آف پاکستان، کراچی، N.M.1957-975/3
گوہر نوشاہی، ''پروفیسر رشید حسن خان کے چند مکتوب''، تحقیقات اردو جرنل، راول پنڈی، جلد ۱، شمارہ ۱، جنوری - جون ۲۰۱۱ء۔
منزوی، احمد، فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۳-۱۹۹۷ء۔
نوشاہی، عارف، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، مرکز پژوہشی میراث مکتوب، تہران، ۲۰۱۲ء۔
W.Ivanow:Concise Descriptive Catalogue of the Persian Manuscripts in the Curzon Collection Asiatic Society of Bengal,Calcutta,second supplement,Calcutta,

کولمبیا یونیورسٹی کے ایک اسکالر Mr. Arthur Dudney نوادر الالفاظ مرتب کر رہے ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں وہ علی گڑھ گئے اور وہاں کے نسخوں سے استفادہ کیا تھا۔ ان صاحب سے میں نے استفسار کیا کہ آیا مغرب میں نوادر کے نسخے ہیں؟ اس کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ریاست ہائے متحدہ میں تو کوئی نہیں، لیکن کینڈا کی ایک لائبریری میں دو نسخے ہیں۔ اسی طرح برٹش لائبریری (لندن) اور باڈلین لائبریری (آکسفورڈ یونیورسٹی) میں چند نسخے ہیں جو انیسویں صدی عیسوی کے مکتوبہ ہیں:

میں ڈاکٹر عطا خورشید صاحب، شعبۂ مخطوطات، آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں غرائب اور نوادر کے نسخوں کے درست کوائف مہیّا فرمائے اور رشید حسن خان کے اس مقالے کو ڈھونڈتے رہے جس کا ذکر خود خان صاحب نے کیا ہے لیکن وہ تا حال نہیں مل سکا۔

تذکرہ ید بیضا کا تنقیدی جائزہ
اور قلمی نسخوں کی تفصیلات
(۲)

ڈاکٹر زرینہ خان

فردوسی طوسی کے تذکرے میں آزاد ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ فردوسی محمود غزنوی کے دربار میں رسائی کے لیے کوشاں تھا، اسی دوران غزنی میں وہ ایک شعر و سخن کی مجلس میں پہنچ گیا۔ وہاں فرخی، عسجدی اور عنصری جیسے قد آور محمود کے درباری شاعر موجود تھے، فردوسی کی کیا بساط، ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اجنبی شخص کو اپنے درمیان دیکھ کر لوگوں نے کہا یہ شعراء کی مجلس ہے اس میں وہی شخص بیٹھ سکتا ہے جو فرخی، عنصری اور عسجدی کے کہے ہوئے تین مصرعوں کے بعد چوتھا مصرع لگائے گا:

عنصری: چوں عارض تو ماہ نباشد روشن
عسجدی: مانند رخت گل نبود در گلشن
فرخی: مژگانت ہمیں کند گذر از جوشن

فردوسی نے چوتھا مصرع لگایا:

فردوسی: مانند سنان گیو در جنگ بشن

فردوسی کی شاعرانہ استعداد اور فی البدیعہ شعر گوئی کے حاضرین محفل قائل ہو گئے۔ (۲۶)

نظیری نیشاپوری کے تذکرے میں صایب تبریزی کا یہ شعر نقل کیا ہے جس میں صائب

شعبۂ فارسی۔ اے، ایم، یو۔ علی گڑھ۔

نے نظیری کو خود سے اور عرفی شیرازی سے بہتر شاعر گردانا ہے۔

صائب چہ خیال است شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نرسانید سخن را (۲۷)

یہ تو ثابت ہے کہ عرفی کا قصیدہ گوئی میں جواب نہیں ہے اور صائب و نظیری غزل کے بادشاہ ہیں۔

نوعی خبوشانی کے تذکرے میں آزاد نے صائب کا شعر نقل کیا ہے جس میں صائب نوعی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ایں جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد
سایہ ابر بہاری کشت را سیراب کرد

نوعی کے تذکرے میں آزاد بلگرامی ''رسم ستی'' کا ذکر کرتے ہوئے ایک قصہ نقل کرتے ہیں۔ایک ہندو نوجوان کی بارات اکبرآباد کے ایک بازار سے گزر رہی تھی ایک چھجے کے نیچے سے جیسے ہی بارات گزری چھجہ گر پڑا اور دولہا اسی وقت ہلاک ہوگیا۔دلہن نے اپنے دولہا کی چتا میں جلنے کا عزم کیا لاکھ منع کرنے پر بھی وہ باز نہیں آئی اور اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہوگئی۔(۲۸)

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد اپنے گرد و پیش کے حالات،رسموں،رواجوں سے باخبر تھے اور نہایت حساس دل رکھتے تھے۔انہیں ہندی شاعری کی بھی خوب سمجھ تھی۔بقول آزاد شعرای ہندی زبان عشق کا اظہار عورت کی جانب کرتے ہیں۔ہندو عورت تمام عمر ایک شوہر کی ہو کر رہتی ہے اور اسے ہی اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتی ہے۔یہاں تک کہ اس کے مرنے کے بعد چتا میں اس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے۔آزاد کی نظر میں ہندو عورت کی بڑی قدر و منزلت تھی۔اس ذیل میں آزاد امیر خسرو کا ایک شعر نقل کرتے ہیں جس میں انہوں نے ہندو عورت کی محبت اور استقلال کی تعریف کی ہے اور تلقین کرتے ہیں کہ عشق میں ہندو عورت سے کم تر نہیں ہونا چاہیے۔

خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کس برای مردہ سوزد زندہ جان خویش را (۲۹)

نظیر مشہدی کے ذکر میں آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ نظیر نے پہلے "نظیری" تخلص اختیار کیا تھا لیکن نظیری نیشاپوری کی درخواست پر "نظیر" تخلص رکھا اور حرف "ی" کے عوض میں دس ہزار روپیہ لیا۔ اس واقعہ کی تفصیل تذکرہ "کلمات الشعراء" مولف محمد افضل سرخوش میں موجود ہے۔(۳۰)

مرزا مظہر جان جاناں سے آزاد کی بہ نفس نفیس ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن مراسلاتی ربط تھا۔ آزاد کی درخواست پر مرزا مظہر جان جاناں نے اپنی مختصر سوانح حیات لکھ کر بھیجی تھی۔

میر عبد الجلیل بلگرامی کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہ آزاد کے نانا اور استاد بھی تھے۔ میر عبد الجلیل جامع علوم وفنون، عالم و فاضل و شاعر تھے۔ آزاد انہیں "خسرو ثانی" کہتے ہیں۔ خسرؔو کی طرح میر عبد الجلیل نے بھی سات بادشاہوں کا دور دیکھا اور خسرو کی طرح خمسہ کے جواب میں چار مثنویاں کہیں۔ میر عبد الجلیل کو مثنوی گوئی میں مہارت حاصل تھی ان کی مثنویاں مدح عالم گیر، جشن طوی محمد فرخ سیر بادشاہ اور بلگرام کی تعریف میں ہیں۔

میر محمد یوسف بلگرامی آزاد کے خالہ زاد تھے، بچپن ساتھ گزرا اور تعلیم بھی ایک ساتھ حاصل کی، دونوں نے میر طفیل محمد بلگرامی، میر عبد الجلیل بلگرامی اور میر محمد بلگرامی سے استفادہ کیا۔ آزاد نے یوسف کی مدح میں ایک غزل کہی جس کا مطلع درج ذیل ہے۔

جان من طلبد بقای یوسف   دل می طپد از برای یوسف

یوسف بلگرامی نے بھی آزاد کی مدح میں غزل کہی

سلطان جہاں گدای آزاد   جم مرتبہ پیشوای آزاد(۳۱)

نقد سخن کی صلاحیت آزاد بلگرامی میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ انہوں نے شعراء کے کلام پر مختصر مگر جامع نقد کیا ہے۔ ملا ظہوری ترشیزی کے متعلق آزاد رقم طراز ہیں:

"نثر ملا ہم طرز خاص دارد، اما غزلش باین رتبہ نیست"۔(۳۲)

حقیقت بھی یہی ہے کہ فارسی ادب میں ظہوری بحیثیت نثر نگار زیادہ معروف ہیں، ان کی کتاب "سہ نثر ظہوری" فارسی ادب کا شاہکار ہے۔

میرزا صائب کے متعلق آزاد کہتے ہیں "مرزا صائب در غزل داد سحر آفرینی دادہ اما در غیر غزل قدم پیش نہ نہادہ"۔ (۳۳) صائب کے متعلق آزاد کی رائے نقادان سخن کی آراء سے

مماثلت رکھتی ہے۔تمام متقدمین نے بالاتفاق صائب کوغزل کا بادشاہ کہا ہے۔عرفی شیرازی کے متعلق آزاد کی رائے ہے کہ ''عرفی شیرامی قصیدہ را بپایہ اعلی رساندامًا غیر قصیدہ را طرزے کہ باید بر کرسی ننشانَد''۔(۳۴)

میرزا جلال اسیر کے متعلق یہ جملہ ہے ''دیوانش سیر نمودہ شد غث وسمین دارد و مضامین تازہ کم واقع شدہ''۔(۳۵)

حاجی محمد جان قدسی کے متعلق لکھا کہ ''مثنوی وقصیدہ قدسی خوب است لیکن غزلش چندان نمک ندارد''۔(۳۶)

اپنے استاد اور جد مادری میر عبدالجلیل بلگرامی کے بارے میں آزاد کی رائے ہے ''شخصی واحد را مشاہدہ می کنیم کہ بسر انجام نوعی از شعر خوب می پرداز دو در نوع دیگر بامقابل سپر می اندازد''۔(۳۷) ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ آزاد نے جن شعراء کا تذکرہ کیا ہے ان کے دیوان، کلیات اور مختلف شعری مجموعوں کا انہوں نے گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا، اشعار کا انتخاب کیا اور عمیق و دقیق مطالعہ کے بعد انہوں نے اپنی جامع رائے کا اظہار کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کا نقد مختصر ہونے کے باوجود اہم اور حقائق پر مبنی ہے۔

آزاد بلگرامی فن تاریخ نویسی میں یکتا تھے۔انہوں نے ''ید بیضا'' میں اکثر شعراء کے لیے منظوم تاریخ وفات کہیں۔مولانا جامی کی تاریخ وفات نقل ہے۔

معدن فضل مولوی جامی زین جہاں رسین فشاں رفتہ
سال تاریخ گفتہ ملہم غیب مولوی جامی از جہان رفتہ(۳۸)
(۸۹۸ھ)

محبّ سید غلام نبی بلگرامی کی وفات عین جوانی میں ہوئی وہ میدان جنگ میں تلوار کے زخم سے فوت ہوئے۔آزاد نے تاریخ وفات نکالی۔

در فن سخن بلند تقریر محبّ در معرکہ آبروی شمشیر محبّ
تاریخ وفات او ز دل پرسیدم فرمود بہشت محفل میر محبّ(۳۹)
(۱۱۶۵ھ)

یکتا احمد یار خان کی تاریخ وفات درج ذیل ہے۔

خان والا رتبہ احمد یار خان ذات او آئینہ خلق عظیم
در فنون و فضل یکتای زمان زادۂ افکار او در یتیم
کرد از معمورۂ سفر ماتم او ساخت دلہا را دونیم
چونکہ یکتا رفت شد تاریخ او جای احمد یار خان بزم نعیم (۴۰)
(۱۱۴۸ھ)

صائب تبریزی کی تاریخ وفات کا یہ انداز ہے۔

عندلیب نغمہ پرواز فصاحت صائبا رفت ازین عالم بسوئے روضۂ دارالسلام
خامۂ آزاد انشاء کرد سال رحلتش بلبل گلزار جنت صائب عالی کلام (۴۱)
(۱۰۸۰ھ)

آزاد بلگرامی نے ید بیضا اور اپنے دوسرے تذکروں میں بہت سے شعراء کی تاریخ وفات کے علاوہ شادی اور ولادت پر بھی تاریخیں کہی ہیں اور دوسرے شعراء کی بھی تاریخیں نقل کیں ہیں۔ آزاد بلگرامی کی لکھی ہوئی تاریخیں جمع کر کے ایک علاحدہ کتاب شائع کی جاسکتی ہے۔

سبک مولف: آزاد بلگرامی کا دور اورنگ زیب اور اس کے بعد کا عہد ہے۔ شاہ جہاں کے دور تک فارسی زبان کے تذکروں میں بیشتر خالص فارسی نظر آتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر تذکرہ نویس یا تو ایرانی النسل تھے یا اگر ہندوستانی تھے تو فارسی زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے۔ اس فارسی کے معیار بلند کے پیش نظر ہندی النسل تذکرہ نویس بھی زبان کے معاملہ میں محتاط تھے۔

اورنگ زیب کے عہد سے ہندوستان میں اردو یا ہندوی میں لکھنے اور پڑھنے کا رواج بڑھا اور فارسی زبان میں اردو اور ہندی کے الفاظ شامل ہوئے۔ اسی وجہ سے اس عہد کی ہندوستانی فارسی ایران کی فارسی سے جدا نظر آنے لگی، تذکرہ ید بیضا اسی بات کی دلیل ہے، اس میں اردو اور ہندی کے الفاظ مثلاً چوتھ، کچہری وغیرہ ملتے ہیں، دوسری طرف عربی الفاظ اور قرآنی آیات کا استعمال بھی اپنی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ جہاں بھی سن مذکور ہیں عربی میں ہیں۔ مثلاً انیسیؔ شاملو کی ''در برہانپور در سنہ ثلث وعشر والف (۱۰۱۳ھ) واقع شد'' ولادت شکیبیؔ ''در سنہ اربع وستین

وتسع مائۃ (۹۶۴ھ) متولد شد''۔

''ید بیضا'' میں سب ہندی کے بیشتر خصائص مثلاً عبارت میں تشبیہات واستعارات کا استعمال ہے۔ البتہ انداز بیان پیچیدہ نہیں ہے۔ عبارت میں سلاست اور روانی ہے۔ گاہ بگاہ آزاد نے نثر مسجع کا استعمال کیا ہے، شعراء کی تعریف وتوصیف میں خوبصورت القابات ہیں جن میں ان کا شاعرانہ تخیل کارفرما نظر آتا ہے۔ مثلاً:

''مرزا صائب امام غزل طرازان وعلامہ سخن پردازان است۔ ازان صبحی کہ آفتاب سخن در عالم شہود پرتو افشاندہ۔ معنی آفرینی باین اقتدار سپہر دوار بہم نرساندہ۔ وناصر علی شیر نیستان سخنوری است ومرد میدان معنی گستری۔ ذوالفقار کلکش بہ تسخیر قلم رو بیان پرداختہ وتصرف طبعش آفتاب سخن را از افق غربی راجع ساختہ''۔

اسی طرح جب آزاد شعرا کا کلام نقل کرتے ہیں تو اس سے پہلے مسجع نثر لکھتے ہیں۔ مثلاً:

جلال اسیر ''این چند رشحہ از خمستانش می چکد''۔

نظیر مشہدی: نظیر آھوان معنی را باین قسم شکار می کند''۔

اسی طرح جب آزاد کسی شاعر کی وفات کا ذکر کرتے ہیں تو کلمات زیبا کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً سحابی استر آبادی۔ فنای صوری را بافنای معنوی ہم آغوش ساخت''۔ غنی کشمیری ''دامن از عالم سفلی بر چید''۔

یقیناً تذکرہ ید بیضا ہم عصر شعراء کے احوال اور نمونہ کلام اور اس دور کے تاریخی حالات کا نہایت معتبر اور مستند ماخذ ہے۔

ید بیضا ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے ہندوستان اور دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ چند کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ید بیضا کے تین قلمی نسخے مختلف ادوار کے موجود ہیں۔

(i) احسن کلکشن ۹۲۰/۷ فارسیہ، تالیف ۱۱۴۸ ہے۔ کاتب سید محمد بلگرامی ہیں۔ یہ نسخہ اصل نسخے سے نقل شدہ ہے اور شاہ جہاں آباد میں ۱۱۵۹ھ میں نقل ہوا۔ مکمل نسخہ ہے۔ کرم خوردہ،

صفحات زرد اور خستہ ہیں۔ بٹر پیپر لگا ہے۔ قابل مطالعہ ہے اوراق ۱۶۷ ہیں۔ سائز ۶۔ ۹x۵۔ سطر ۲۰، پہلے صفحہ پر مہر بیضوی ''گدا بادشاہ شاہ نامش گدا'' ہے۔ شعراء کے تخلص سرخ روشنائی سے تحریر ہیں۔ اس کے علاوہ وقفہ کا نشان ''،'' سرخ روشنائی سے اور اشعار کا انتخاب نقل کرنے سے پہلے ''منہ'' سرخ روشنائی سے تحریر ہے۔ حاشیے میں فروگذاشت عبارت تحریر ہے۔

مقدمہ کے بعد شعراء کے تخلص الفبائی ترتیب سے ہیں:

حرف الف کا آغاز افضل الدین کاشانی کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ آزاد بلگرامی نے اپنے ذکر پر کیا ہے۔ کل ایک سو چونتیس (۱۳۴) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف البای کا آغاز بیدار رازی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ بیرنگ مرزا محمد کے ذکر پر ہوتا ہے کل اٹھاون (۵۸) شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف التای کا آغاز تصنیفی خوانسادی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ تمنا مرزا محمد علی کے ذکر پر ہوتا ہے کل تئیس (۲۳) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الثای کا آغاز ثنائی خواجہ حسین مشہدی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ ثابت میر محمد افضل الہ آبادی کے ذکر پر ہوتا ہے کل پانچ (۵) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الجیم کا آغاز جمال الدین محمد بن عبدالرزاق کے تذکرے سے ہوتا ہے اور جامع کشمیری کے تذکرے پر خاتمہ ہوتا ہے۔ کل پچیس (۲۵) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الحای کا آغاز حجت ناصر خسرو اصفہانی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور حسرت محمد اشرف کے تذکرے پر ہوتا ہے کل چونسٹھ (۶۴) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الخای کا آغاز خاقانی شروانی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ خاشع کے ذکر پر ہوتا ہے کل ستائیس (۲۷) شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف الدال کا آغاز درویش دہکی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ دانا کے تذکرہ پر ہوتا ہے کل سترہ (۱۷) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الذال کا آغاز ذوالفقار کے تذکرے سے ہوتا ہے اور ذہنی کاشی کے تذکرے پر خاتمہ ہوتا ہے کل چار (۴) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الراء کا آغاز رودکی سمرقندی کے تذکرے سے ہوتا ہے، خاتمہ روانی اکبرآبادی کے ذکر پر ہوتا ہے کل چونسٹھ (۶۴) شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف الزای کا آغاز زندگی شیرازی کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ زیب النساء بنت عالم گیر بادشاہ کے تذکرے پر ہوتا ہے کل پندرہ (۱۵) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف السین کا آغاز سنائی غزنوی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ سرآمد کشمیری کے ذکر پر ہوتا ہے کل تہتر (۷۳)

شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف الشین کا آغاز شطرنجی سمرقندی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ شاعر کے تذکرے پر ہوتا ہے کل چھپن (۵۶) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الصاد کا آغاز ادیب صابر ترمذی سے ہوتا ہے اور خاتمہ ملا صادق توئی سرکانی کے تذکرے پر ہوتا ہے کل پینتالیس (۴۵) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الضاء کا آغاز ضیاء الدین فارسی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ ضمیر میرزا روشن کے ذکر پر ہوتا ہے کل دس (۱۰) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الطاء کا آغاز طیان کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ طبعیت شیخ سیف الدین کے ذکر پر ہوتا ہے کل اکتیس (۳۱) شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف الظاء کا آغاز ظہیر فاریابی کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ ظہیرا کے ذکر پر ہوتا ہے کل آٹھ (۸) شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف العین کا آغاز عباس مروزی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ عابد خواجہ عبدالرحیم کے ذکر پر ہوتا ہے کل ستانوے (۹۷) شعرا کا ذکر ہے۔ حرف الغین کا آغاز غضائری رازی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ غالب میر جلال الدین کے تذکرے پر ہوتا ہے کل چھبیس (۲۶) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الفای کا آغاز فردوسی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ فصیح اکبرآبادی کے ذکر پر ہوتا ہے کل پچپن (۵۵) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف القاف کا آغاز قطران تبریزی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ قانع سیوستانی سید مرتضیٰ کے تذکرے پر ہوتا ہے کل سینتیس (۳۷) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الکاف کا آغاز کمال الدین اسماعیل بن جمال الدین کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ کرامی کے تذکرے پر ہوتا ہے کل چوالیس (۴۴) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف اللام کا آغاز لطف اللہ نیشاپوری کے ذکر سے ہوتا ہے اور خاتمہ لائق میر محمد مراد کے تذکرے پر ہوتا ہے کل آٹھ (۸) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف المیم کا آغاز منجنیک ترمذی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ مشتاق کے ذکر پر ہوتا ہے کل ایک سو پینتالیس (۱۴۵) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف النون کا آغاز نظامی گنجوی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ نثار دہلوی کے تذکرے پر ہوتا ہے کل چورانوے (۹۴) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الواو کا آغاز وحشی بافقی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ وارد محمد شفیع شاہ جہاں آبادی کے ذکر پر ہوتا ہے کل بیالیس (۴۲) شعراء کا تذکرہ ہے۔ حرف الہای کا آغاز ہمام تبریزی کے تذکرے سے ہوتا ہے اور خاتمہ ہمت محمد عاشق گورکھپوری کے تذکرے پر ہوتا ہے کل ستائیس (۲۷) شعراء کا ذکر ہے۔ حرف الیای کا آغاز یمین کے تذکرے

سے ہوتا ہے اور خاتمہ میر محمد یوسف کے ذکر پر ہوتا ہے کل بیس (۲۰) شعراء کا ذکر ہے۔

آخر میں آزاد بلگرامی نے اپنی مفصل سوانح لکھی ہے۔اسی طرح کل بارہ سو چوون (۱۲۵۴) شعراء کا تذکرہ ہے۔

(ii) شاہ منیر کلکشن ،بکس نمبر ۲/۴۔ ۱۲۴۵ھ کا مکتوبہ، کاتب کا نام مٹا ہوا ہے۔مکمل نسخہ ہے۔خط نستعلیق میں تحریر ہے۔اوراق ۲۲۴ ہیں۔سطر ۱۵-۱۴ ہیں۔کرم خوردہ،صفحات زرد ہیں۔ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔سرخ روشنائی سے شعراء کے تخلص، وقفہ کا نشان اور مقدمے میں زننده وچشم گیر بنانے کے لیے عبارت کے نیچے سرخ روشنائی سے لکیر کھینچی ہوئی ہے وَ آزاد نے اپنے اشعار نقل کرنے سے پہلے ''لمولفہٗ'' سرخ روشنائی سے لکھا ہے،خواندگی نسخہ ہے۔

(iii) سبحان اللہ کلکشن ،ضمیمہ ۹۲۰/۴۶۔ نامکمل نسخہ ہے۔

حرف العین تک شعراء کے نام ہیں۔نہایت کرم خوردہ ہے۔کسی حد تک قابل خواندنی ہے۔بٹر پیپر لگا ہوا ہے۔تخلص سرخ روشنائی سے ہیں۔اشعار سے پہلے۔ نشان سرخ روشنائی سے اور وقفہ کا نشان،، بھی سرخ روشنائی سے تحریر ہیں۔فروگذاشت عبارت حاشیہ میں تحریر ہے۔ اوراق ۲۲۷ ہیں۔

۲- کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ید بیضا کے دو قلمی نسخے موجود ہیں جو تذکرہ ''صبح خندان'' کے نام سے موسوم ہیں۔

(i) ید بیضا نمبر ۱۵۵۔خط شکستہ۔ (ii) ید بیضا نمبر ۱۵۶۔۱۲۹۷ھ کا مکتوبہ۔

۳- انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ نمبر ۳۹۶۶، کتابت ۱۱۸۷ھ۔

۴- آقا محمد ابراہیم گرھی یاسمین سندھ، پاکستان کے ذاتی کتب خانے میں ید بیضا کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

۵- کتب خانہ شبلی نعمانی،ندوہ،لکھنؤ میں ید بیضا کا ناقص الآخر نسخہ ہے۔

۶- ٹیگور لائبری لکھنؤ یونیورسٹی میں قلمی نسخہ تذکرۃ الشعرای فارسی کے نام سے فہرست مخطوطات فارسی میں موجود ہے۔

۷- بانکی پور پٹنہ میں قلمی نسخہ نمبر ۶۹۱ پر موجود ہے۔اوراق ۱۳۰،سطر ۲۱،سائز ۵×۸،

$\frac{3}{4}$۶x$\frac{3}{4}$،۶x۱۰۔ مکمل نسخہ ہے۔

۸-سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد فہرست مخطوطات فارسی میں دو نسخے موجود ہیں۔

(i) قلمی نسخہ نمبر ۵۴۵، ۵۰، ۵اوراق ۴۱۹، سطر ۱۵-۱۱، سائز ۸x۵. ۱۲۔ کاتب میر رضا حسین ہیں۔ چودھویں صدی کا مکتوبہ ہے۔

(ii) قلمی نسخہ نمبر ۵۴۶، ۵۰۔ خط نستعلیق۔ کتابت ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ۔ اوراق ۱۷۷، سطر ۲۵-۱۱، سائز"۸.۲x"۱۳ء۔

پاورقی

(۲۶ تا ۲۸) تذکرہ ید بیضا (مخطوطہ)۔ (۲۹) سرو آزاد، ص ۱۶۲۔ (۳۰) کلمات الشعراء، ص ۱۲۴۔ (۳۱ تا ۴۱) ید بیضا (مخطوطہ)۔

مآخذ و منابع:

۱- تذکرہ ید بیضا (مخطوطہ)، احسن کلکشن $\frac{920}{2}$ ف، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ، مولف میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

۲- تذکرہ سرو آزاد، کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد، مولف میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

۳- تذکرہ خزانہ عامرہ، منشی نول کشور، کانپور، مولف میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

۴- شجرہ طیبہ (مخطوطہ)، حبیب گنج کلکشن ف ۱۱/۳۳، مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ، مولف میر غلام علی آزاد بلگرامی۔

۵- تذکرہ کلمات الشعراء، عالم گیر پریس، تحصیل بازار، لاہور، مولف محمد افضل سرخوش۔

۶- تاریخ ادبیات ایران (اردو) ندوۃ المصنّفین، جامع مسجد، دہلی، مولف رضا زادہ شفق، مترجم سید مبارز الدین رفعت۔

۷- بیست مقالۂ قزوینی، چاپ تہران، ایران، مولف عبدالوہاب قزوینی۔

اندلسیات کا ایک غم ناک باب موریسکی

پروفیسر محمد حسان خان

تونسی مورخ ڈاکٹر عبدالجلیل تمیمی نے مغرب اسلامی یعنی اندلس کے موریسکیوں کی غمگین داستان کی یاد تازہ کردی ہے، موریسکی کون ہیں؟ اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں لیوی پروفنسال نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ یہ اصطلاح اسپین کے ان مسلمانوں پر بولی جاتی ہے جو کیتھولک حکمراں فرڈینانڈ اور ایزبلا کے غرناطہ پر ۲؍جنوری ۱۴۹۲ء کے قبضہ کے بعد وہاں رہ گئے، اس اصطلاحی تعریف میں ایک اہم جزء شامل نہیں کیا گیا، جس کو اسپین کی رویل اکیڈمک ڈکشنری میں واضح کیا گیا ہے ''یہ اصطلاح ان مراکشی لوگوں (مسلمانوں) کے لیے بولی جاتی ہے جو اسپین کے عیسائیوں کے ذریعہ اسپین واپس لیے جانے کے بعد اسپین ہی میں رہ گئے اور عیسائی ہوگئے، اس تعریف میں موریسکیوں کی جو خصوصیت بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ عیسائی ہوگئے تھے، یہ تعریف پہلے سے زیادہ جامع ہے لیکن مانع نہیں ہے کیونکہ مسلمان اپنی آزاد مرضی سے عیسائی نہیں بنے تھے اسی لیے ان کی اکثریت مسلمان بنی رہی جیسا کہ ایک تفتیشی عدالت میں ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ ''وہ اسلامیت میں الجزائر کے مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں''، یعنی ان کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ چھپ کر مسلمان ہیں، بجبر عیسائی بنا لیے جانے کے بعد بھی اسلام ان کے دل میں برابر باقی رہا، یہ ضرور ہوا کہ بعض ذہین طلبہ کو کیتھولک اسکولوں میں داخلہ مل گیا، بلکہ بعض لوگ چرچ کے پادری بھی ہوگئے، یہ لوگ ظاہر میں عیسائی طریقوں کا اظہار کرتے لیکن جب وہ اکیلے ہوتے تو کمرہ بند کرکے چھپ کر نماز پڑھتے، ڈاکٹر عبدالجلیل تمیمی نے اپنے ایک انٹرویو میں تفتیشی عدالت کی دستاویز کی روشنی میں بتایا کہ غرناطہ کے پانچ بڑے چرچوں کے

شعبہ عربی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال۔

موریسکی پادری سقوط غرناطہ کے کافی عرصہ بعد یعنی ۱۷۲۸ء میں اس لیے زندہ جلا دیے گئے کہ وہ ظاہراً عیسائی تھے اور اصلاً مسلمان تھے۔

موریسکیوں کا قصہ اسلامی اور انسانی اعتبار سے دردناک المیہ ہے، ایک قوم کو اس سرزمین سے نیست و نابود کر دیا گیا جہاں وہ نو صدیوں (۷۱۱ء سے ۱۶۱۱ء) تک رہی، قتل عام سے جو بچے ان کو بجبر عیسائی بنالیا گیا اور یہ کارنامہ اس معاہدہ صلح کے بعد انجام دیا گیا جو شاہ فرڈیناڈ اور غرناطہ کے آخری حاکم ابوعبداللہ کے درمیان ہوا، اگر اس ظلم کا نیا اصطلاحی نام رکھنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اندلس کے مسلمانوں کو حکومت اسپین کی طرف سے جبراً ہجرت کرائی گئی اور یہ جدید دور کی پہلی نسلی صفائی تھی، ایسی صفائی دوبارہ پھر فلسطینیوں کی اپنے وطن سے ہوئی۔

''موریسکی اسٹڈیز سینٹر'' کے ڈائرکٹر عبدالجلیل تمیمی کے بقول اسپین کے شاہ خوان کارلس نے یہودیوں سے ان تکالیف پر جو ان کو سقوط غرناطہ کے بعد اسپینی حکومت کے کارندوں سے پہنچی تھی معذرت کی، لیکن ان مسلمانوں سے انہوں نے کوئی معافی یا معذرت نہیں کی جو موریسکیوں کی نسل سے ہیں، جو اگر نہ ہوتے تھے تو بقول مشہور اسپینی مورخ امریکو کاسترو اسپین کی جدید تاریخ اس طرح تشکیل نہ پاتی جیسی کہ وہ ہے کیونکہ یورپی نشاۃ ثانیہ اسپین کے ذریعہ ہی ہوئی ہے۔

عبدالجلیل تمیمی کی اس موضوع سے دلچسپی ۴۰ سال پرانی ہے جبکہ وہ ۱۹۶۶ء میں عثمانی وزارت عظمی کے آرکائیوز میں الجزائر کی تاریخ پر کام کر رہے تھے، وہ پہلے عربی شخص تھے جن کی پہنچ اس رکارڈ تک ہوئی، عثمانی عہد کے الجزائر کی تاریخ پر مواد تلاش کرنے کے دوران ان کو بہت اہم دستاویزات ہاتھ لگیں جن سے عثمانی عہد کے موریسکیوں کے حالات کا علم ہوا، ان دستاویزات میں اہل غرناطہ کا شاہ سلیمان قانونی کے نام عریضہ ہے اور باب عالی نے بندقیہ کے دوق (بادشاہ) اور ملکہ کیٹرین دی میڈچ کو جو اس وقت ولی عہد تھیں موریسکیوں کے سلسلہ میں خط لکھا وہ بھی ہے، تمیمی کو ان دستاویزات کی اہمیت کا اندازہ ہوا، اسی وجہ سے انہوں نے موریسکیوں کی تاریخ کی طرف توجہ کی۔

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ موریسکیوں کی تاریخ اسپینی حکومت کی دستاویزات

کی بنیاد پر یعنی تفتیشی عدالتوں کے رکارڈ سے تیار کی گئی ہے جو کہ مسلمانوں کی زبردست دشمن تھیں، مورخین یہ بھی مانتے ہیں کہ اس تاریخ کے لکھنے میں عثمانی اور عربی دستاویزات کی تلاش و تحقیق اور ان سے استفادہ بھی ضروری ہے، اس وجہ سے تمیمی کو عثمانی آرکائیوز کی اہمیت کا اندازہ ہوا اور پھر یہی ان کا خاص موضوع ہو گیا، ایک بین الاقوامی محقق لوئی کارزایا نے موریسکیوں کی تاریخ کے حوالے سے اسپین کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جدلی بحث پر پی ایچ ڈی کی، اس مقالہ کو تمیمی نے دیکھا اور فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ کر کے شائع کر دیا۔

لوئی کارزایا تمیمی کی ملاقات ہوئی تو اس اندلس کے موریسکیوں پر Montpellier یونیورسٹی میں ایک سمینار کی اطلاع دی، اس سمینار میں تمیمی اور بعض عرب مورخین شریک ہوئے، مقالہ نگاروں کی اکثریت اسپین اور امریکہ سے تعلق رکھتی تھی، اس کانفرنس میں غیر مسلم مغربی مورخوں کے تجزیے اور خیالات موضوعیت اور سچائی سے دور تھے، تمیمی ان ماہرین اندلسیات کو تونس میں اسی موضوع پر ایک سمینار کی دعوت اس مقصد سے دی، ان لوگوں کو عربی فضا کا مشاہدہ ہو، تونس کے محلے، مسجدیں اور لوگوں کو دیکھنے اور برتنے کا موقع بھی ان کو ملے، اس طرح ۱۹۸۳ء میں منعقدہ کانفرنس سے میرا اس موضوع سے تعلق مستحکم تر ہو گیا، اس وقت سے اب تک انھوں نے تیرہ کانفرنسیں کیں، ان کا مقصد واضح ہے کہ موریسکیوں کی تاریخ ایک اہم موضوع بن جائے جہاں ایک قوم کے جبری اخراج کے بعد بھی طویل عرصے تک ظلم و ستم جاری رہا، موریسکیوں کی تاریخ کے سلسلہ میں مغربی اسپینی اور اسلامی نقطۂ نظر میں اختلاف ہے، تمیمی کو Montpellier کانفرنس میں بڑی حیرانی ہوئی جب ایک بڑے اسکالر نے یہ اظہار خیال کیا کہ تفتیشی عدالتوں کی دستاویزوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان موریسکیوں کو زندہ جلایا گیا، بلکہ پہلے قتل کیا گیا پھر جلایا گیا، حالانکہ دلائل، دستاویزات اور گواہیاں ثابت کرتی ہیں کہ ان لوگوں کو زندہ جلایا جاتا تھا، بہر حال یہ موضوع اسپینی ضمیر کے لیے بہت حساس ہے اور موریسکیوں کا یہ المیہ حد درجہ غم ناک ہے، تاریخ انسانی میں تعذیب کی ایسی اور مثالیں شاید ہی ملیں، مسلم عربی قوم ۸۰۰ سال تک شبہ جزیرہ ایبیریا میں رہی اور اسپین کی تاریخ اور عالمی فکری وراثت پر زبردست اثر انداز ہوئی تو آج تک باقی ہے اور جس کی وجہ سے آج سالانہ ۵۰ لاکھ سیاح اس تاریخی ورثہ کو دیکھنے اسپین آتے

ہیں ، ایسی عظیم روایت اور وراثت کو مسیحی تعصب اور عدم رواداری نے ختم کر کے اسپین کو عالمی کیتھولک تعصب کی بھٹی میں جھونک دیا اور ہر اس چیز کو ختم کر دیا جو غیر کیتھولک تھی ، یہ تاریخ میں عدم رواداری کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے، تعصب نے ایک متعدد مذاہب والے ملک کو تباہ کر دیا، حالانکہ غرناطہ کے آخری بادشاہ شاہ ابوعبداللہ نے شہر کو صلح سے سونپ دیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ عربوں کے دین اور ان کی زبان کی حفاظت کی جائے لیکن دو یا تین سال بعد اسپینی مسیحی حکومت اپنے وعدوں سے پھر گئی اور موریسکیوں کو مجبور کیا کہ یا تو وہ عیسائی بن جائیں یا ملک چھوڑ دیں ، المیہ کا آغاز یوں ہوا کہ مسلمانوں کو عربی بولنے سے، مسجد میں جانے سے ، جمعہ کو سفید کپڑے پہننے سے روک دیا گیا، مذہبی اور سماجی بندشیں پچاسوں تھیں، اس کے علاوہ لوگوں کی ذاتی اور وقف کی ملکیت پر قبضہ کر لیا گیا، موریسکیوں کو مکمل غلام بنانے کی مذموم کارروائیاں جاری رہیں اسی لیے وہ پوری سولہویں صدی میں بغاوتیں کرتے رہے، خاص طور پر ۱۵۶۸ کی کوہ بشارات کی بغاوت بہت مشہور ہے جس میں آخر کار مسلمانوں کو شکست ہوئی غرناطہ کے لوگوں کو غرناطہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا اور یہ ایک اور ٹریجڈی تھی اور اسپین کے دوسرے اور شہروں سے ہجرت کر کے دوسری جگہ جانے پر مجبور کیا گیا، موریسکیوں کی خصوصیات ختم کر دی گئیں، تاریخ گواہ ہے کہ تقریباً ۲۰۰ آباد موریسکی شہروں کو برباد کر دیا گیا، اسپین کے ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ اسپینی معاشیات کو ان شہروں کو برباد کر دینے سے زبردست نقصان ہوا، موریسکی معدنیات، صنعتوں، کھیتی، آبپاشی اور تجارت کے ماہر تھے، اس خسارے کو پورا کرنے کے لیے اسپین نے جنوبی امریکہ پر تسلط قائم کر کے وہاں کی دولت کو حاصل کیا

موریسکیوں کی دردناک کہانی کی تفصیلات اب عیاں ہوتی جاتی ہیں، بیٹے کو باپ کے خلاف جاسوسی پر اکسایا گیا اسی طرح رشتہ داروں کو ایک دوسرے کے خلاف تفتیشی عدالتوں میں شکایت درج کرانے کے لیے مجبور کیا گیا، کسی کے پاس اگر کوئی عربی نشانی مل جاتی تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا اور مقدمہ چلتا، علم و فن کی عربی وراثت ہزاروں مخطوطات میں محفوظ تھی، اس کو برسر عام جلا کر خاک کر دیا گیا، کچھ موریسکیوں نے اپنے گھر کی دیواروں میں ان مخطوطات کو چن دیا، اس طرح کے بعض مخطوطات ان دیواروں سے ۱۹ صدی کے آخر میں نکالے گئے ۔

تمیمی نے اس المیہ کو سمیناروں کے ذریعہ پوری دنیا کو روشناس کرنے کی سعی پیہم کی ہے، جو امور اور حقائق معلوم ہوئے ان کو شائع کیا اب تک انہوں نے تین سو سے زیادہ مطالعات شائع کیے ہیں جن کا تعلق موریسکی ادب، تاریخ، تفتیشی عدالتوں اور زندہ جلانے کی تعذیب سے ہے، ان تحقیقات سے معلوم ہوا کہ موریسکی عورت خاندان کی قائد اور سردار تھی، وہ نہ صرف بچوں کی تربیت اور گھر کی دیکھ بھال کرتی تھی بلکہ حساب کتاب کی ماہر ہوتی تھی، مالیات فراہم کرنے کے ساتھ دین اور زبان کی حفاظت کی خدمت انجام دیتی تھی، اس کے لیے راہ حق میں اس کو مصائب کا سامنا کرنا پڑا، بہت سی عورتوں نے اپنی زبانیں کاٹ لیں تھیں تاکہ وہ اپنے شوہروں اور بچوں کی چغلی پر مجبور نہ کی جاسکیں، یہ داستاں بہت خوفناک ہے لیکن افسوس ہے کہ عالم اسلام اس وقت بھی خواب میں تھا اور آج بھی وہ اس سے غافل ہے، اندلس کے بارے میں صرف تعمیرات اور عیش وعشرت کا علم ہے، جو کچھ موریسکیوں پر گذرا اس کا ذرا سا اندازہ عربوں اور مسلمانوں کو نہیں، تمیم منفی موقف کی مذمت کرتے ہوئے مسلسل اس کوشش میں ہیں کہ عالم اسلام اسپین کی حکومت اور بادشاہ کو موریسکیوں پر ہوئے ظلم کے لیے کم از کم وہ معذرت کرائے جو انہوں نے یہودیوں سے کی ہے۔

اسپین کے ایک بڑے مورخ رافائیل نے موریسکیوں کے موضوع پر ریسرچ کی ہے، انہوں نے اپنی کتاب تمیمی کو ترجمہ کے لیے دی، تمیمی اس کتاب کو پڑھ کر روتے رہے، ۱۶۰۹ میں موریسکی نکال دیے گئے، لیکن اس کے بعد بھی بہت سے لوگ باقی رہ گئے، کہا جاتا ہے کہ نکالے گئے لوگوں کی تعداد دس لاکھ تھی بعض کہتے ہیں کہ ان کی تعداد ۵ لاکھ تھی، فرانسیسی مورخ ہنری لابیر کے مطابق ان کی تعداد تین لاکھ تھی، ان لوگوں کی اکثریت تونس، الجزائر اور مراکش ہجرت کرگئی، کچھ استنبول آگئے لیکن ایک بڑی تعداد رشتہ داریوں کے سبب وہیں رہ گئی، یہ لوگ ظاہری طور پر عیسائی ہوگئے لیکن اندرونی طور پر مسلمان رہے، اسپین کے ایک مورخ نے تحریر کیا کہ غرناطہ کے پانچ اہم چرچوں کے پادریوں کو اسلامی شعائر کی ادائیگی میں پکڑا گیا اور ان کو زندہ جلادیا گیا، اس تحقیق کو تمیمی نے اپنی کتاب ''اندلس کے موریسکیوں کی نئی اسٹڈیز'' میں شامل کرکے شائع کردیا ہے اور لکھا کہ جب بھی میں اس تحقیق کا مطالعہ کرتا ہوں بلا ارادہ میرے آنسو نکل آتے

ہیں کہ یہ المیہ ایسا ہے کہ اس کی کوئی مثال تاریخ انسانی میں نہیں پیش کی جاسکتی، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب ان موریسکیوں کو ۱۶۰۹ میں نکالا گیا تو اسپین کے متعصبین نے ان کی تمام املاک اور جائداد پر قبضہ کرلیا اور ان کو خالی گاؤں میں چھوڑ دیا گیا جس سے نصف آبادی لقمہ اجل بن گئی، کچھ لوگوں نے تونس میں پناہ لی، تونس نے تقریباً ایک لاکھ موریسکیوں کو پناہ دی، یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ عرصہ دراز تک اسپینی زبان میں ہی تعلیم پاتے رہے، ۲۵ ہزار نے الجزائر میں اور ۵۰ ہزار نے مراکش میں پناہ لی، لیکن اکثر پناہ لوگوں نے تونس یا استنبول میں ہی لی، ان لوگوں کی اکثریت عربوں کی تھی کیونکہ ان کے گھروں میں عربی دستاویزات پائی گئیں''۔

آج اسپین میں ایک نیا قومی رجحان پیدا ہورہا ہے نوجوان فخر کررہے ہیں کہ ہم اندلسی موریسکی ہیں بہت سے اسپینی عیسائی پھر اسلام کی آغوش میں آگئے ہیں اور وراثت کی حفاظت کررہے ہیں، غرناطہ کا سقوط ۵/جنوری ۱۴۹۲ کو ہوا تھا، یہ لوگ ہر سال ۵/جنوری کے دن کو یادگار کے طور پر مناتے ہیں، تمیمی کا سوال ہے کہ کیا مسلمان ملکوں میں اس دن کچھ ہوتا ہے، بدقسمتی سے کچھ نہیں ہوتا، ۱۹۹۱ کے آخر میں یہ خبریں آئیں کہ شاہ خان کارلس ۲۱/ مارچ ۱۹۹۲ کو جس دن ۵۰۰ سال پہلے یہودی اسپین سے نکالے گئے تھے، اپنے خطاب میں یہودیوں سے معذرت کریں گے اسپین کے سفیر اور تقریباً دنیا بھر کے ۱۰۰ دانشور اور محققین موجود تھے، تمیمی نے شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ہم نے سنا ہے کہ آپ یہودیوں سے معذرت کریں گے یہ بہت اچھی بات ہے لیکن عرب اور مسلمان بھی اس معذرت کے منتظر ہیں، ہم بدلہ، ہرجانہ یا کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتے ہیں، ہم صرف معذرت چاہتے ہیں، کیونکہ یہ تہذیبی موقف کی علامت ہے لیکن بادشاہ نے صرف یہودیوں سے معذرت کی اور ان کو دوبارہ اسپین کی جنسیت عطا کی، یہودیوں کی عبادت گاہ گئے اور ان کی ٹوپی پہنی اور مسلمانوں کا کوئی ذکر نہیں کیا، پروفیسر عبدالجلیل نے بادشاہ کو خط لکھا کہ ہم آپ کے اس شریفانہ طرزعمل پر شکرگزار ہیں جو آپ نے یہودیوں کے ساتھ برتا، آپ کی معذرت اس بات کی علامت ہے کہ یہ اسپین کا نیا انداز ہے لیکن ہم عرب اور مسلمان برابر منتظر ہیں کہ آپ اس طرح کا طرزعمل ہمارے ساتھ اختیار کریں، اس وقت مسٹر انجیل مورانتیوس (جو وزارت خارجہ میں عالم عرب سیل کے ذمہ دار تھے اور بعد میں وزیر خارجہ ہوئے) وہاں تھے

انہوں نے تمیمی سے کہا کہ بادشاہ نے آپ لوگوں سے جامع قرطبہ میں ملنے کا پلان بنایا ہے اور وہ اس مناسبت سے خطاب بھی کریں گے، لوگوں کو فطری طور پر اس سے بڑی خوشی ہوئی، اس پروگرام میں چار لوگ عالم عرب کے تھے، ڈاکٹر محمود علی مکی مصر، شاعر محمود درویش فلسطین، ڈاکٹر محمد بن شریفہ مراکس اور تمیمی تونس سے، باقی تقریباً ۱۰۰ لوگ اسپین کے عرب نژاد تھے، بادشاہ نے خطاب کیا اور صرف یہ کہا کہ ''اس وقت اسپینی حکومت نے جو مناسب سمجھا وہ کیا'' انہوں نے کوئی معذرت نہیں کی، تمیمی نے پھر بادشاہ کو خط لکھا کہ آپ کے معذرت نہ کرنے سے بڑی مایوسی ہوئی، اگرچہ عالم عرب و اسلام خاموش ہے لیکن ایک مورخ کی حیثیت سے خوب اندازہ ہے کہ ماضی میں عربوں کے ساتھ کیا ہوا، اس لیے ان کا معذرت کا مطالبہ حق بجانب ہے، یہ نتیجہ ہے عالم عرب کے اجتماعی موقف کا نہ ہونے کا، عالم عرب اسپین کی عزت کرتا ہے، اسپین کو رعایت سے پٹرول دیتا ہے، اسپین کی سیاحت میں عربوں کا بڑا حصہ ہے، ان کا یہ موقف غیر انسانی بلکہ عنصریت اور تعصب سے بھرا ہوا ہے، مسلمانوں اور عربوں کی کمزوری ہے کہ وہ اسپین کو معذرت پر مجبور نہ کر سکے لیکن اسپینیوں کے ضمیر میں تاریخ کے اس سیاہ صفحے کی ایک ایسی کرائیس ہے جو کسی نہ کسی انداز سے ظاہر ہوتی رہتی ہے، کبھی اسپینی اس کو پردے میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر تجاہل برتتے ہیں، کبھی اس کے لیے عذر ڈھونڈتے ہیں یا جو ان کے آباء و اجداد نے کیا ہے اس کو ہلکا کر کے پیش کرتے ہیں یا اعتراف نہ کرنے کی قسم کھا کر اس المیہ سے پیچھا چھڑاتے ہیں، یقیناً اس جرم کا اعتراف آسان نہیں ہے کیونکہ اس سے اسپین کی شہرت اور تاریخ پر دھبہ آتا ہے لیکن یہ سب چیزیں اس صریح ظلم کو چھپا نہیں سکتیں جو انہوں نے موریسکیوں کا اخراج کر کے کیا، کیونکہ وہ تاریخ میں پہلی نسلی تطہیر تھی۔

عرب یورپ میں فلک شگاف عمارتیں بنا رہے ہیں، ہارورڈ اور بہت سی جامعات کا مالی تعاون کر رہے ہیں لیکن وہ اپنی تاریخ کی حفاظت سے صحیح طرح عہدہ برآ نہیں ہو رہے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اندلسی موریسکی اسٹڈیز کا اسٹیرنگ اسپینیوں کے ہاتھ میں ہے وہ جس طرح چاہتے ہیں اور جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں اور عرب تقریباً غائب ہیں، اس وقت ۲۵۰ سے زیادہ اسپینی امریکی فرانسیسی مورخین موریسکی اسٹڈیز میں منہمک ہیں جبکہ عربوں کے یہاں دس لوگ بھی اس

کام کی طرف متوجہ نہیں ہیں، تمیمی کہتے ہیں کہ ہم نے دوسری کانفرنس ۱۹۸۳ میں منعقد کی تو ہم نے سینکڑوں لوگوں کے سامنے نئے انداز سے بات کی، ہم اسپین کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ہم اسپین سے محبت کرتے ہیں، کیونکہ ہماری ان کے ساتھ تہذیبی وراثت میں شراکت داری ہے، تہذیبی شراکت عربوں اور اسپینیوں کے درمیان تاریخ کا ایک حصہ ہے، یورپ کی موجودہ ترقی کی اصل اندلس اور عرب ہیں علم و معرفت کے ہر شعبے میں ہزاروں مخطوطے عربی سے یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئے، ابن رشد ہزار مثالوں میں سے ایک ہیں، عقلیات، سائنسی اور جدید ایجادات میں یہ ورثہ مشترک ہے جس میں اسپینیوں نے بے شک اندلسی وراثت میں حصہ لیا لیکن یہ عربوں کی اصلاً وراثت ہے لیکن اسپینیوں کی یا یورپ والوں کی طرف سے اس وراثت سے انکار ایک بڑی ٹریجڈی ہے اور اسی وجہ سے وہ لوگ عربوں سے معذرت سے کتراتے ہیں، یہودیوں سے معذرت کی اور عربوں سے نہیں''، یہ موضوع اسپینیوں کو پریشان کرتا رہتا ہے لیکن اسپین میں کچھ انصاف پسند لوگ بھی ہیں، گو وہ اقلیت میں ہیں ان میں سے ایک مورخ امریکا کاسترو ہیں وہ اپنی ضخیم کتاب تاریخ اسپین میں تحریر کرتے ہیں کہ عہد جدید میں جو صورت اسپین (سائنسی ترقی کی شکل میں) کی تشکیل پائی، اگر عربی عہد نہ ہوتا تو وہ اس طرح تشکیل نہ پاتی، اسی طرح بڑے اسپینی مستعرب (عربیات کے ماہر) کوریرا ہیں، جنہوں نے بیسویں صدی کے شروع میں یورپ کو دعوت دی تھی کہ اس کو عربی روح بلکہ اسلام کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جی چاہتا ہے کہ موریسکولوجی کسی دن عربوں اور اسپینیوں کو قریب کردے، حالانکہ وہ لوگ اس موضوع سے بہت گھبراتے ہیں لیکن جس دن ان لوگوں کو عقل آجائے گی اور اپنے ظلم کا احساس ہوگا اور وہ معذرت خواہ ہوں گے، اس دن یہ علم دونوں قوموں کو جوڑنے کا کام دے گا اور ایک نئی پہل ہوگی۔

عربوں اور مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ اگر انہوں نے موریسکیوں پر ظلم کا احتساب نہ کیا تو پھر ایک نئی اندلسیات سے واسطہ پڑے گا کیونکہ اسپینی اپنے انداز سے اس موضوع پر لکھ رہے ہیں جس میں بہت سے منفی پہلو ہیں، ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم صرف رندی کے قصیدے کو پڑھ کر ہلکا پھلکا غم کرتے ہیں، لاکھوں دستاویزات موریسکیوں سے متعلق ہیں، کیا کسی نے ان کو پڑھا؟ ہزاروں تفتیشی عدالتوں کی فائلیں ان لوگوں سے متعلق ہیں جن پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے،

جسم کے ٹکڑے کیے گئے اور بہت ہی دردناک موت سے ہمکنار کردیے گئے، عالم عرب واسلام پر ان لوگوں کا قرض ہے صرف اندلس کی تہذیب پر فخر کافی نہیں، ان کے ذمہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی نسلوں اور اولادوں کے بارے میں تحقیق کریں آج پانچ سو سال بعد ان کو انصاف دلائیں اور اسپین کی حکومت کو معذرت و معافی پر مجبور کریں، تمیمی کہتے ہیں کہ ''میری ایک تحقیق اس موضوع سے متعلق ہے جو ابھی قریب میں شائع ہوئی ہے، میں نے دو مخطوطے حاصل کیے یہ موریسکیوں کے بالکل آخری لوگوں کے ۱۵۸۸ کے ہیں، یہ لوگ اپنے ادب کو قشتالوی زبان بحروف عربی (الخمیادو) میں تحریر کرتے تھے، انہوں نے تفتیشی عدالتوں کے ذریعہ ڈھائے گئے، مظالم کا تذکرہ کیا ہے، اس زمانہ کے ہمارے پاس اس وقت ۳۰۰ مخطوطے ہیں اور اس کو ''ادب الالخمیادو'' کہا جاتا ہے، اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں ایک بار جنوبی امریکا میں پورٹیریکو کی ایک یونیورسٹی میں گیا اور وہاں میں نے الالخمیادو ادب کی سب سے بڑی لائبریری دیکھی جس میں ۲۴ ماہرین موجود تھے جو اس زبان کے واقف کار اور ماہر ہیں، ان لوگوں نے کئی چیزیں شائع کی ہیں، ان میں ایک ماہر سالفہ تواریفولو بھی ہے اس شخص نے موریسکیوں کی ٹریجڈی پر زبردست گفتگو کی، پھر ہم کو ترکی میں بعض موریسکی مخطوطے ملے، اس طرح میگان لائبریری، ایکس آن پرافنس یونیورسٹی، فرانس میں بھی اس سے متعلق مخطوطات ہیں، اسی طرح پوریٹریکو میں ایک محترمہ پوری دنیا میں موریسکی اسٹڈیز کی سب سے بڑی ماہر ہیں، اس سب کے باوجود اس موضوع پر ہماری معلومات بہت ناقص ہیں، حالانکہ ہم ۶۰۰ سے زیادہ تحقیقی کتابیں اس موضوع پر چھاپ چکے ہیں، میں پھر مطالبہ کرتا ہوں کہ اندلسی موریسکی اسٹڈیز کا ایک مرکز قائم کیا جائے، عرب بہت سی فضول خرچیاں کرتے ہیں یہ بڑا کام ان کے ذمہ ہے، سینکڑوں ڈاکٹریٹ کے تھیسس موریسکیوں پر اسپینی، انگریزی اور فرانسیسی میں ہیں جن کا ترجمہ عربی میں نہیں ہوا ہے دنیا میں موریسکولوجی کے بہت بڑے بڑے ماہر ہیں جنہوں نے اس موضوع پر لکھا ہے لیکن عربی میں منتقل نہ ہوسکا یہ کرنے کا بڑا کام ہے بہرحال یہ ایسی ٹریجڈی ہے جو بھلانے کی پوری کوششوں کے بعد بھی نہیں بھلائی جاسکتی ہے''۔

(مضمون کو مختلف ویب سائٹوں کی مدد سے تیار کیا گیا)

الفلسفة الهندية القديمة

قدیم ہندو فلسفے سے متعلق مولانا عبدالسلام خاں رام پوری کی عربی تصنیف کا تعارف

ڈاکٹر تبسم صابر

ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے۔مختلف مذاہب کے ماننے والے میں سے ہر ایک کی اپنی ایک جداگانہ تہذیب ہے۔چونکہ ان میں سب سے قدیم ہندو مذہب ہے۔اس لیے ہندوستانی تہذیب کو سمجھنے کے لیے قدیم ہندو فلسفے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ہندوستان کی دوسری مختلف زبانوں کی طرح عربی، فارسی اور اردو میں بھی ہندو مذہب اور اس کی تہذیب وثقافت سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں مولانا عبدالسلام خاں رام پوری کی ایک عربی تصنیف ''الفلسة الهندية القديمة'' کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالسلام خاں رام پوری کا شمار دور حاضر کے ان نامور علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے علمی دنیا میں نمایاں کارناموں کے نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی تحریریں ان کے وسعت مطالعہ، دقت نظر اور متانت قلم کی آئینہ دار ہیں۔مولانا عربی، فارسی اردو، فرانسیسی اور جرمنی زبان کے مستند عالم تھے۔مولانا کو زیادہ تر دلچسپی فلسفہ، منطق اور تصوف کے فکری اور نظری پہلوؤں سے رہی لہٰذا ان کی اکثر نگارشات انہیں موضوعات سے متعلق ہیں۔جن میں افکار رومی، افکار اقبال، برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصنیفات، ابن عربی کا نظریہ وحدت الوجود، شاہ محبّ اللہ الہ آبادی کے رسالے 'تسویہ' کا اردو ترجمہ اور جرمن فلاسفر نٹشے کے خطبات کا اردو ترجمہ موسومہ بہ 'خطبات زرتشت' قابل ذکر ہیں۔علاوہ ازیں مولانا نے اور بھی کتابیں لکھیں نیز مختلف النوع موضوعات پر ان کے

رام پور، یوپی۔

پچاس سے زائد مقالات ہندو پاک کے متعدد موقر جریدوں اور رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا کی ولادت ۱۹۱۷ء میں ہوئی اور چند سال قبل ۱۳/اپریل ۲۰۰۹ء کو تقریباً ۹۲ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

زیرتبصرہ کتاب قدیم ہندو فلسفے سے متعلق مولانا کے ان نو عربی مقالات کا مجموعہ ہے۔ جو انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی فرمائش پر سپرد قلم کیے تھے۔ یہ مقالات انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے آرگن 'ثقافة الهند' میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ جن کی وجہ سے مولانا کو ۱۹۹۱ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے عربی اسکالر سے نوازا گیا۔ بعد میں ان مقالات کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر رام پور رضا لائبریری بورڈ نے انہیں یکجا کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور ۱۹۹۶ء میں یہ کتاب رسالہ 'ثقافة الهند' کے چیف ایڈیٹر اور ممتاز اسکالر پروفیسر نثار احمد فاروقی کے مقدمے سے مزین ہوکر ۲۶۹ صفحات میں طبع ہوکر منظر عام پر آئی۔ ہندوستان کے قدیم ہندو فلسفے، اس کے ادب اور تاریخی پس منظر سے متعلق عربی زبان میں یہ کام اتنا معلوماتی اور تحقیقی انداز کا ہے کہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

جیسا کہ مذکور ہوا زیرتبصرہ کتاب میں کل نو مقالات ہیں جن کے عنوانات اور ان سے متعلق تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

۱- پہلے مقالے کا عنوان ہے "فلسفة الهند القديمة"، جس کے تحت مولانا نے ہندو مذہب کے اصل مآخذ چاروں ویدوں کا تعارف پیش کیا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ رگ وید چاروں ویدوں میں سب سے قدیم ہے اور رگ ویدی دیوتاؤں کی حمد وثنا اور عقائد و اوامر ونواہی پر مشتمل ہے۔ ان عقائد اور ماموات ومنہیات کو اگرچہ عقل وفکر، مشاہدات ومحسوسات اور زندگی کے تجربوں سے یکسر معریٰ نہیں کہا جاسکتا تاہم وید کسی معنی میں فکر وفلسفہ نہیں۔ ان کی فکری قدر و قیمت 'کیوں' اور 'کیسے' کے فطری اور عام سوالات تک محدود ہے۔ بقیہ تین وید؛ سام وید، یجر وید اور اتھر وید ہیں لیکن ان کی اپنی ذاتی اور آزاد قیمت نہیں۔ سام وید کے ۷۵ بھجنوں کو چھوڑ کر رگ وید کے بھجنوں پر ہی یہ مشتمل ہے اور ان کی قرأت کے طریقوں کا بیان ہے۔ یجر وید کے اشلوکوں میں مزید کچھ ابتدائی اصول ہیں، اتھر وید ایک طرح سے منتروں جنتروں کا مجموعہ ہے۔

علاوہ ازیں اس مقالے میں مولانا نے ویدوں کی پرانی تفسیروں جن کو ارنیک، برہمن گرنتھ اور اُپ نیشد کہتے ہیں مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے ہندو مذہب اور اس کے تاریخی ممیّزات پر روشنی ڈالی ہے۔

۲- دوسرا مقالہ مذہب زیر بحث کی حقیقتوں کے پہلے دور سے متعلق ہے جسے ویدی دور کہتے ہیں۔اس مقالے کا عنوان "**الفکر الھندوسی فی العصر الویدی**" ہے اس میں مولانا نے بالترتیب چاروں ویدوں کے افکار اور بنیادی تصورات کی توضیح وتشریح کی ہے۔

۳- اس کے بعد تیسرے مقالے میں مذہب زیر بحث کی حقیقتوں کے دوسرے دور یعنی اُپ نیشدی دور پر معتدل تبصرہ کیا ہے۔جس کا عنوان ہے "**الفکر الھندوسی فی العصر الابنشدی**"۔جس کا حاصل یہ ہے کہ اُپنی شدٗ ویدوں کے اختتامی حصے اور انہیں کی طرح مقدس سمجھے جاتے ہیں۔فلسفہ وفکر کی ابتدا انہیں سے ہوتی ہے۔ان کی کل تعداد ایک سو بارہ تک پہنچ گئی ہے۔جس کا سلسلہ ۵۰۰ ق م سے چودہویں پندرہویں صدی مسیحی تک چلا گیا ہے۔اپنیشدوں کا موضوع معرفت ہے لیکن ان کی راہ معرفت متعین نہیں ہے۔ان اپنیشدوں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ خارجی تغیر پذیر عالم کے بطن میں ایک غیر متغیر ثابت وقائم حقیقت ہے جو انسانی حقیقت سے کامل مطابقت رکھتی ہے اور نا قابل بیان وتعبیر ہے۔زیر بحث مقالے میں مولانا نے بعض جگہ توضیح وتشریح کے خیال سے ان اپنیشدوں کے قدرے طویل اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔جن سے اعمال حسنہ، نجات اور مسئلہ تناسخ کے تصور پر روشنی پڑتی ہے۔

۴- چوتھا مقالہ "**الافکار المعاصرۃ للابنشدات القدیمۃ**" کے عنوان سے ہے جس میں قدیم اپنیشد کے معاصر افکار، ہندوؤں کے حلقہ ہائے فکر، ہندوستان میں فلسفے کی نشونما، ہندوستان کے فلسفیانہ نظام، فلسفیانہ ادب اور قدیم فلسفے کے مشہور مدارس اور ان کی قسموں پر تبصرہ کیا ہے۔علی الخصوص مدرسہ کارواکیہ کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے اور ان کے نظریہ علم، روح اور مادے سے متعلق ان کے خیالات ورجحانات، عالم غیر مرئی کے بارے میں ان کی فکر، کائنات کی تخلیق اور نیکی وبدی سے متعلق ان کے تصورات پر بڑے واضح انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

۵- پانچواں مقالہ "**البــــوذیۃ**" کے عنوان سے ہے اس میں بدھ مذہب کی ابتدا اور

ترقی کی نسبت اطلاعات فراہم کی گئی ہیں اور بدھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ کی زندگی کے تینوں ادوار بادشاہت، ریاضت وتلاش حقیقت اور تبلیغ وخدمت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان آٹھ اصولوں کا جائزہ لیا گیا ہے جن پر عمل کرنا بدھ مذہب کی رو سے ضروری ہے۔ بدھ مذہب کا ایک ہی فلسفہ ہے ''دکھ سے رہائی''۔ جس کے حصول کے لیے مہاتما بدھ نے آٹھ اصول مقرر کیے ہیں:

۱-صحت اعتقاد، ۲-صحت مقاصد، ۳-صحت گفتار، ۴-صحت اعمال، ۵-صحت معاشرت، ۶-صحت خیالات، ۷-صحت کوشش، ۸-صحت غوروفکر۔

مہاتما بدھ کے نزدیک ان آٹھ اصولوں پر چلنے سے انسان موت، پیدائش، درد وغم، آواگون، بیماری اور کمزوری، غرض ہر قسم کی تکلیف سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ مہاتما بدھ کے حالات زندگی بیان کرنے کے بعد مولانا نے ان کے مقلدین کے مذہبی اختلافات اور مقدس بودھی ادب کا تفصیلی ذکر کیا ہے ساتھ ہی بدھ کی تبلیغی تقریروں سے اقتباسات کے حوالے دیے ہیں۔ جن سے کائنات سے متعلق بدھ کے تصور، روح کے بارے میں ان کے خیالات، نروان یا نجات کے بارے میں ان کی سوچ اور ان کے اخلاقی تصورات کی تصویر سامنے آتی ہے۔

۶-چھٹے مقالے میں جین مت کے افکار وخیالات، اس کے متبعین کے طریقۂ کار، مذہب زیر بحث کے حقیقی بانی ''پارشواناث'' اور ان کی تعلیمات نیز ان کے چیلے ''مہاویر وردھمان'' کے حالات زندگی اور ان کی تبلیغی کوششوں کا مفصل ذکر کیا گیا ہے اور جینیوں کے مقدس ادب، علم اس کے انواع وحدود، ان کے تین راستوں (صحیح اعتقاد، صحیح علم اور صحیح کردار) کی وضاحت کرتے ہوئے وجود، اعمال اور تاثیر کے اعتبار سے اس کی قسموں، اللہ کے تصور، روح اور اس کی اقسام، زمانہ، خلد، نیکی وبدی اور نجات کے راستوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ ''**الجینیة**'' کے عنوان سے ہے۔

۷-ساتویں مقالے کا عنوان ہے'' **فلسفة مهابهارتا او البرهمية المستحدثة**'' اس مقالے میں مولانا نے بہ سعی بلیغ مہابھارت کے فلسفے، بنیادی افکار، ملفوظات اور عقائد کی تسوید کی ہے۔

۸-آٹھواں مقالہ ''**صحيفة بهاغود غيتا**'' کے عنوان سے ہے۔ جس کے تحت

ہندوؤں کی مقدس کتاب بھگوت گیتااوراس کے اندراجات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔اس مقالے میں تقریباً بیس ضمنی عنوانات ہیں۔جن میں بھگوت گیتا کے مصادر، مقام ومرتبہ، مرکزی دعوت اور اہم شخصیات وغیرہ کے ذکر کے علاوہ اخلاق، جبر واختیار، اعمال، زندگی وموت اور نجات کے راستوں سے متعلق کتاب زیر بحث کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔

۹-اس کے بعد آخری مقالہ "المناظر للفلسفة الهندية او المدارس الست" کے عنوان سے ہے۔جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر چہ اپنیشد وں کا موضوع معرفت ہے لیکن اس میں راہ معرفت متعین، متمیز اور واضح نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کافی ابہام ہے۔ یہ مختلف رایوں اور رنگ برنگ خیالات کا مجموعہ ہے۔جن پر بعد کے دور کے چھ مکاتب فکر سانکیا، یوگا، ویشیشیکا، نیایا، میمانسا اور ویدانت کی بنیاد ہے اور چونکہ اپنیشد وں کا یہ مرکزی خیال کہ 'خارجی تغیر پذیر عالم کے بطن میں ایک متغیر ثابت وقائم حقیقت ہے جو انسانی حقیقت سے کامل مطابقت رکھتی ہے اور نا قابل بیان وتعبیر ہے' اچھا خاصا مبہم اور متعدد ومختلف تشریحوں کا محتاج ہے، لہٰذا بعد کے دور کے ان چھ مکاتب فکر نے اپنے اپنے طور پر ان کی تشریحیں کی ہیں۔اس کے بعد تمام مکاتب فکر کے عقیدوں اور مسائل مختلفہ کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا یہ اس کتاب کا آخری مقالہ ہے جس کے بعد مصادر ومراجع کی فہرست ہے جس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ مولانا نے ان موضوعات کو قلم بند کرتے وقت کس درجہ تحقیقی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ان کے مصادر ومراجع میں مہابھارت اور گیتا کی مختلف اردو وفارسی شرحیں بھی ہیں اور قدیم وجدید حکماء کی ہندو فلسفے کے موضوع پر لکھی گئی نگارشات بھی۔

بہر حال ان مقالات سے جہاں مولانا مرحوم کی عربی زبان میں مقالہ نگاری کا بلند معیار واضح ہوتا ہے اور ان کی وسعت معلومات اور تاریخ وفلسفے پر عبور حاصل ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے وہیں اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ میں دوسری ہندوستانی زبانوں کے ساتھ عربی زبان نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔

''کتاب المبانی لنظم المعانی''
کے نام سے موسوم تفسیر کا مولف کون؟

غانم قدوری حمد☆

ترجمہ: محمد عمیر سفیان اصلاحی☆☆

قرآنی علوم سے دلچسپی رکھنے والے محققین عموماً جن کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں ان میں سے ایک کتاب ''مقدمتان فی علوم القرآن'' ہے جو مشہور مستشرق آرتھر جیفری کی تحقیق سے ۱۹۵۴ء(۱) میں شائع ہوئی، کتاب دو عظیم الشان تفسیروں کے مقدموں پر مشتمل ہے:

۱- پہلا مقدمہ تفسیر ''کتاب المبانی لنظم المعانی'' کا ہے جس کے مولف اب تک مجہول رہے ہیں اور جو کتاب کے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲- دوسرا مقدمہ، ابو محمد عبد الحق بن غالب بن عطیہ الاندلسی التوفی ۵۴۶ھ کی تفسیر ''المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز'' کا ہے اور کتاب کے ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے یعنی کتاب کے صفحہ ۲۵۱ سے ۲۹۳ تک۔

یہ دونوں مقدمے محققین کے درمیان معروف رہے ہیں اور ان سے استفادہ کا سلسلہ طباعت کے بعد بلکہ طباعت کے پہلے سے جاری ہے۔(۲)

آج بھی یہ دونوں مقدمے خصوصاً کتاب المبانی کا مقدمہ اپنی ضخامت اور افادیت کی وجہ سے اپنے موضوع کے اہم مصادر میں شمار کیا جاتا ہے۔

آرتھر جیفری نے کتاب المبانی کے مقدمے کی اشاعت کے لیے جس واحد نسخہ پر اعتماد

☆ سابق استاذ کلیۃ الشریعۃ، جامعہ بغداد۔

☆☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نیو دہلی۔

کیا ہے وہ برلین کے کتب خانہ (مخطوطہ نمبر ۱۰۳۳ فنشتین) میں محفوظ ہے۔کتاب المبانی کے مولف کا کوئی سراغ نہیں ملتا کیونکہ کتاب کا ایک ہی نسخہ موجود ہے اور اس کا سرورق ضائع ہو چکا ہے، جیسا کہ محقق نے بیان کیا ہے، البتہ مقدمہ کے باقی اوراق سے کتاب کے بارے میں کچھ معلومات ضرور مل جاتی ہیں۔کتاب المبانی دراصل قرآن کریم کی تفسیر ہے اور مولف نے دس فصلوں پر مشتمل اس کا ایک مقدمہ تحریر کیا ہے، اس تفسیر کے مزاج اور مولف کے طرز تالیف کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں کیونکہ ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں البتہ تفسیر کے اس مقدمے کے تعلق سے کچھ گفتگو کی جاسکتی ہے جسے آرتھر جیفری نے تفسیر ابن عطیہ کے مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کا نام ''مقدمتان فی علوم القرآن'' رکھا ہے۔

زیرنظر تحریر دراصل کتاب المبانی کے مولف کا سراغ لگانے کی ایک کوشش ہے کیونکہ مولف کے مجہول ہونے سے ان قیمتی مطالب کی اہمیت گھٹ جاتی ہے جن کا مولف نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں ذکر کیا ہے اور کتاب کا مجہول المولف ہونا ہی اس تفسیر کے مطالعہ اور اشاعت کی جانب سے بے اعتنائی کا بڑا سبب ہے۔

جب اس تفسیر کا مقدمہ شائع ہوا تو فطری طور پر اس کے مولف کے بارے میں واقفیت کی خواہش اور بڑھی، ڈاکٹر محمد ابوشہبہ کتاب (المدخل لدراسۃ القرآن الکریم) میں لکھتے ہیں:

> ''ہوسکتا ہے خدا مجھے یا کسی اور محقق کو اس کتاب کے مولف کا سراغ لگانے کی توفیق بخشے''۔(۳)

کتاب میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور جو روایتیں ذکر کی گئی ہیں ان کی درستگی اور انہیں فکر اسلامی کی تاریخ میں صحیح مقام پر رکھنے کے لیے مولف کے بارے میں جاننا اہمیت کا حامل ہے۔

شرعی علوم کی بنیاد وہ اقوال و روایات نہیں ہوسکتے جو مجہول الحال مولفوں کی کتاب میں ہیں، وجہ ظاہر ہے کہ اقوال و روایات کی نسبت صحیح طور پر اصل مصادر کی جانب صحیح اور غلط کی پہچان کے لیے ضروری ہے۔

کئی سالوں سے راقم السطور مطبوعہ مقدمہ کے ذریعے کتاب کے مولف کے حالات

سے واقفیت کے لیے کوشاں ہے لیکن مولف کے متعلق چند معلومات حاصل کرنے کے باوجود کسی نتیجے تک نہیں پہنچا جاسکا، اس لیے اس موضوع کو وقتی طور پر ترک کردینا پڑا، کچھ عرصے بعد جب کتاب ''الایضاح فی القراءات العشر واختیار ابی عبید وابی حاتم'' کا ایک مخطوطہ ملا تو پھر اس کتاب کی یاد آئی، کیونکہ الایضاح میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن سے توقع ہوئی کہ کتاب المبانی کے مولف تک رسائی کے لیے یہ مفید اور کارآمد ہوسکتی ہیں۔

اس تحریر میں اولاً کتاب المبانی کے حوالہ سے اور پھر کتاب الایضاح کے مخطوطہ کے تعلق سے معلومات پیش ہیں، ان کے علاوہ بعض دوسری کتابوں کا بھی ذکر آئے گا جنہوں نے مستور الحال مصنف کی شخصیت سے پردہ اٹھانے کی کچھ کوشش کی ہے۔

۱- کتاب المبانی کی روشنی میں: تصنیف و تالیف میں قدیم علماء کی بالعموم یہ روایت رہی ہے کہ وہ کتاب کے شروع میں اپنا مکمل نام ذکر کرتے ہیں، بسم اللہ اور حمد و ثنا کے بعد ''قال فلان بن فلان'' کہہ کر اپنا تعارف کراتے ہیں۔ کبھی کبھی کتاب میں بھی مولف کا نام کئی بار آجاتا ہے، عموماً مخطوطات میں پہلا یا پہلے صفحات دست برد زمانہ کا شکار ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے مخطوطات شناسوں کے سامنے مولف یا مصنف کی شناخت کا مسئلہ آجاتا ہے۔

کتاب المبانی لنظم المعانی کے مولف کی دریافت میں ایسی ہی مشکل کا سامنا ہوا، کتاب کا پہلا ورق ضائع ہوگیا اور بدقسمتی سے کتاب کے اندرونی صفحات میں بھی کہیں مولف کا نام نظر نہیں آیا۔

یہ بھی نہیں معلوم کہ کتاب کے وہ اجزاء جو کتب خانہ برلن میں محفوظ ہیں، ان میں کہیں مولف کا ذکر ہے یا نہیں۔

اس طرح آرتھر جیفری کا شائع کردہ مقدمہ مجہول المولف ہوگیا اور اس کے مولف کی دریافت ہی محققین کے لیے اصل مسئلہ بن گئی۔

کتاب المبانی کے مقدمہ سے اتنا ضرور ہوا کہ مولف کے زمانہ، اساتذہ اور تصانیف کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل ہوئیں، ذیل میں ہم ان کا ذکر کرتے ہیں، جیسے:

کتاب کا نام: کتاب المبانی لنظم المعانی۔ (مقدمتان، ص۶)

مولف کا زمانہ اور کتاب کی تاریخ تالیف: میں نے اس کتاب کی تالیف بہ روز اتوار ماہ شعبان المعظم ۴۲۵ھ میں شروع کی۔ (مقدمتان، ص۶)

مولف کی دیگر کتابیں: ان فصلوں میں سے ہر فصل کے لیے کچھ کتابیں اور مقالات تحریر کیے گئے ہیں جن کا ہم نے بالاختصار اس کتاب میں ذکر کر دیا ہے اور جنہیں تفصیل درکار ہو وہ ہماری ان کتابوں کی طرف رجوع کریں جن کو ہم نے اس کے ہر باب کے سلسلے میں تالیف کیا ہے۔ (مقدمتان، ص۷)

مطبوعہ مقدمہ کے درمیان میں مولف کی بعض دوسری کتابوں کے نام آئے ہیں جن کی کل تعداد ۳ ہے، وہ نہیں جیسا کہ کتاب کے محقق نے ذکر کیا ہے۔ (۴)

۱-کتاب الابانة والاعراب (مقدمتان، ص۱۱۶)۔ **۲-کتاب الزینة فی سوالات القرآن** (نامکمل) (مقدمتان، ص۱۱۶)۔ **۳-کتاب الدرر فی ترفیع السور** (مقدمتان، ص۱۷۲)۔

آج ان کتابوں کی کوئی خبر نہیں کیونکہ میرے علم کے مطابق مخطوطات کے معروف خزانوں کے فہارس ان کے ذکر سے خالی ہیں:

مولف کے شیوخ: مقدمے کے مطالعہ سے مولف کے بعض شیوخ کا علم ہوا۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱-ابوعبیداللہ محمد بن علی (۵)۔ ۲-ابوالقاسم عبداللہ بن محمشاذ (۶)۔

ان دونوں کا ذکر مولف نے اس طرح کیا ہے اور یہ ساری احادیث بعینہ شیخ ابوسہل کی تصنیف "**فیہ ما فیہ**" میں مذکور ہیں لیکن میرے پاس ان کی سند نہ تھی اور مجھے ان کی سند ان روایات میں مل گئی جن کی اجازت مجھے دو شیوخ ابوعبیداللہ محمد بن علی اور شیخ ابوالقاسم عبداللہ بن محمشاذ نے مرحمت فرمائی تھی، میں نے ان دونوں سے روایت اس لیے کی ہے کہ میں مشائخ کے ذکر کے درمیان آ جاؤں اور کتاب بابرکت ہو۔ (۷)

۳-ابوعبداللہ محمد بن الہیصم: مولف کا بیان ہے "ہمیں شیخ ابوعبداللہ محمد بن الہیصم نے اجازت مرحمت فرمائی"۔ (۸)

ان تینوں شیوخ کے علاوہ کتاب میں متعدد علماء اور رواۃ کے نام مذکور ہیں لیکن ان کا تعلق قدیم طبقات سے ہے، احمد بن ابی عمر کی کتاب الایضاح مولف کے شیوخ میں کسی چوتھے نام کا اضافہ نہیں کرتی لیکن اس میں ایک شخص کا ذکر کبھی ابوالحسن احمد بن القاسم الفارسی (۹) کے نام سے آتا ہے اور کبھی ابوالحسین محمد بن القاسم الفارسی کے نام سے، یہ دونوں نام غالباً دو عالموں کے ہیں، کسی ایک کے نہیں۔(۱۰)

۲- کتاب الایضاح فی القراءات العشر کی روشنی میں مولف کتاب المبانی کے حالات

کتاب الایضاح فی القراءات العشر واختیار ابی عبید وابی حاتم) احمد بن ابی عمر کی انتہائی مفید کتاب ہے، اس میں توضیحات وتشریحات کے ساتھ قراءتوں کے ذکر سے پہلے کچھ ابواب بطور مقدمہ تالیف کیے ہیں، جن کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ ہر باب میں علم کی ایک ایسی قسم کا ذکر ہے جس سے علم قراءت اور علوم قرآنی کا طالب علم مستغنی نہیں ہوسکتا۔ کتاب الایضاح اب بھی مخطوطہ کی صورت میں ہے، اس کا ایک نسخہ جامعہ استنبول کی لائبریری میں محفوظ ہے، اس کا نمبر (۱۳۵۰) ہے اور اس نسخہ کی ایک میکروفلم معہد المخطوطات العربیۃ قاہرۃ میں محفوظ ہے۔(۱۱)

یہ ۲۵۰ اوراق پر مشتمل ہے، میں نے معہد المخطوطات قاہرہ کے نسخہ سے زیراکس کیا ہوا ایک نسخہ حاصل کیا تھا لیکن افسوس کہ یہ نقل اتنی خراب ہے کہ کتاب کے بہت سے صفحات نہیں پڑھے جاسکے، نسخہ کی اسی خرابی کی وجہ سے غالباً محققین اور اسکالرس نے اس سے بےاعتنائی برتی ہے ورنہ یہ نسخہ برسوں سے معہد المخطوطات العربیۃ قاہرہ میں موجود ہے، دوسری طرف اصل نسخہ جو جامعہ استنبول کی لائبریری میں محفوظ ہے اس کا حصول بھی ایک دشوار گزار عمل ہے۔

بہرحال کتاب الایضاح میں جو عبارتیں پڑھنے میں آسکیں ان میں میری نگاہ اس نام پر پڑی جو کتاب المبانی کے مقدمے میں میری نگاہ سے گزر چکا تھا۔ یعنی امام ابوعبداللہ محمد بن الہیصم۔

کتاب الایضاح اور کتاب المبانی کے مقدموں کا باہم موازنہ کرنے کے بعد یہ خیال اور راسخ ہوا کہ کچھ ابواب میں علمی مواد کی یکسانی، دونوں کتابوں کے کچھ نہ کچھ تعلق کی جانب اشارہ کرتی ہے، خاص طور سے مصحف کی جمع وتدوین اور قرآن کے سبعۃ احرف میں نازل ہونے کے موضوعات۔

یہی وہ نقطہ تھا جہاں کتاب المبانی کے مولف کی دریافت کا شوق پھر پیدا ہوا، یہ حقیقت بھی سامنے تھی کہ کتاب المبانی کے مولف زمانی اعتبار سے کتاب الایضاح کے مولف سے مقدم ہیں، کیونکہ اول الذکر نے کتاب کی تالیف ۴۲۵ میں شروع کی جبکہ ثانی الذکر کی وفات ۵۰۰ھ کے بعد ہوئی ہے جیسا کہ ابن جزری نے غایۃ النہایۃ میں ذکر کیا ہے۔ (۱۲)

دونوں کتابوں میں اسناد کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے خاکسار کو اس نتیجہ تک رسائی میں کامیابی ملی کہ احمد بن عمر یعنی کتاب الایضاح کے مولف کتاب المبانی کے مولف کے شاگرد ہیں اور انہوں نے اپنے استاد کے نام کی تصریح اس طرح کی ہے۔ ''ابومحمد حامد بن احمد بن جعفر بن بسطام''، راقم السطور کے نزدیک کتاب المبانی لنظم المعانی نامی تفسیر کے مولف یہی ابومحمد ہیں، جن کی محققین کو مدت سے تلاش تھی۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے میرے قرائن و قیاسات کو زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، اس لیے صرف چند مثالیں پیش ہیں:

(الف) احمد بن ابی عمر نے کتاب الایضاح کے دوسرے باب میں (ورق ۷ظ-۱۷ ظ)، وہ بیشتر معلومات نقل کی ہیں جو کتاب المبانی کے مقدمے کی نویں فصل میں موجود ہیں۔ (کتاب المبانی، ص ۲۰۷-۲۳۴)

ذیل میں دونوں کتابوں میں مذکور اسناد کے کچھ سلسلوں اور دونوں کی کچھ عبارتوں کا ایک موازنہ پیش کیا جاتا ہے:

مقدمہ کتاب المبانی ص ۲۰۷	کتاب الایضاح ورق ۷ظ
اخبرنا الشيخ ابو عبد الله محمد بن الهيصم رضي الله عنه ، اجازة ، قال: اخبرنا ابو علي احمد بن محمد قال : حدثنا ابو (سعيد) الاصطخرى القاضي قال : حدثنا احمد بن المنصور الرمادي قال :	اخبرنا ابو محمد حامد بن احمد رحمه الله ، قال : اخبرنا الشيخ الامام ابو عبد الله محمد بن الهيصم بن احمد قال : اخبرنا ابو علي احمد بن محمد قال : حدثنا ابو (سعد) الاصطخري القاضي

حدثنا عبد الرزاق بن همام عن معمر ......)

قال : حدثنا احمد بن منصور الرمادي قال حدثنا عبد الرزاق بن همام عن معمر ......)

مقدمہ کتاب المبانی ص۲۱۷

"قال الشيخ محمد بن الهيصم : ان القيني (۱۳) عفا الله عنا و عنه قد احسن الترتيب لهذه الوجوه، ولكنه ان كان قصد من ذكرها تبيين اللغات السبع التي زعم انها متفرقة في القرآن وحمل عليها قول النبى ضلى الله عليه وسلم نزل القرآن على سبعة (اوجه) فانه لم يضع البيان موضعه ۔

کتاب الایضاح ورق۱۲و

"وقال الشيخ الامام الهادي محمد بن الهيصم : ان القينى تغمده الله برحمته : ان القيتبي عفا الله عنا و عنه قد احسن الترتيب لهذه الوجوه ولكنه قصد من ذكرها تبيين اللغات السبع التي زعم انها متفرقة في القرآن وحمل عليها قول النبى (عليه السلام) : نزل القرآن على سبعة احرفه فانه لم يضع البيان موضعه ......) ۔

مقدمہ کتاب المبانی ص۲۲۳

عن قطبة ، قال : سمعت النبي صلى الله عليه (وسلم) يقرأ في الفجر : (والنخل باسقات لها طلع نضيد) فمد نضيد (؟) وهو يرثي اخاه :فاصبحت لا ادعو من الناس واحدا سوى الده في الدار غير حكيم ۔

کتاب الایضاح ورق۱۴و

" ...... عن قطبة ، قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم يقرأ في الفجر : (والنخل باسقات لها طلع نضيد) فمد نضيد (وهو في هذه الرواية بالسين وقد تبدل الالف بدل الواو من ولده، قال : يرثي اخاه :فاصبحت لا ادعو من الناس واحد سوى الده في الدار

غیر حکیم ۔

مذکورہ مثالوں کے تقابل سے دونوں کتابوں کے درمیان کے تعلق سے ثابت ہوتا ہے کہ احمد بن ابی عمر نے کتاب المبانی پر اعتماد کیا ہے۔ پہلی مثال میں سندوں کے سلسلہ میں مولف کا نام سامنے آتا ہے جو کتاب الایضاح میں متعدد جگہوں پر مذکور ہے۔

دوسری اور تیسری مثال سے دونوں کتابوں کے درمیان مطابقت سامنے آتی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صاحب کتاب الایضاح نے اپنے شیخ کی عبارت حرفاً حرفاً نقل کیا ہے۔

۳- کتاب المبانی کتب تراجم کی روشنی میں: مندرجہ بالا سطور میں جن علماء کا تذکرہ ہوا ہے، دوسری کتب تراجم میں ان کا ذکر بھی قابل توجہ ہے۔ مثلاً ابن الجزری کی کتاب ''غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء'' میں محمد بن الہیصم کا ذکر اس طرح ہے:

''محمد بن الہیصم نام اور کنیت ابوعبداللہ ہے، امام اور قاری ہیں، صاحب کتاب الایضاح احمد بن ابی عمر نے ان پر اعتماد کیا ہے اور حامد بن احمد کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے، نیز ان سے مروی کچھ مفید باتیں اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں''۔(۱۵)

حامد بن احمد صاحب کتاب المبانی کے بارے میں ابن الجزری کا قول ہے:

''حامد بن احمد نام اور کنیت ابومحمد ہے، انہوں نے امام ابوعبداللہ محمد بن الہیصم سے قراءت کی روایت کی ہے اور ان سے صاحب ایضاح نے قراءت کی روایت کی ہے''۔(۱۶)

ابن الجزری کے یہ اقوال ہماری تائید کرتے ہیں کہ کتاب المبانی لنظم المعانی کے مولف ابومحمد حامد بن احمد بن جعفر بن بسطام ہیں اور یہ کہ کتاب الایضاح کے مولف احمد بن ابی عمر نے متعدد مقامات پر ان سے عبارتیں نقل کی ہیں نیز ان ہی کے واسطے سے ابوعبداللہ محمد بن الہیصم سے بھی متعدد نصوص نقل کی ہیں۔

کتاب المبانی کے مولف مشرقی ہیں یا مغربی: آرتھر جیفری نے لکھا کہ:

''جہاں تک کتاب المبانی کے مولف کا سوال ہے تو وہ غیر معروف

ہیں، البتہ ان کی زبان و بیان اور اسناد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغربی عالم ہیں''۔(۱۷)

لیکن ہمارا قیاس یہ ہے کہ وہ مشرقی عالم ہیں، کیونکہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''مجھے شیخ ابوالقاسم عبداللہ بن محمشاذ رضی اللہ عنہ نے ہراۃ میں خبر دی''۔(۱۸)

اور یہ سب جانتے ہیں کہ ''ہرات'' مشرقی ملک کا شہر ہے، اسی طرح ان کا یہ قول ہے کہ:

''اور اس کی دلیل ایک حدیث ہے جس کو ابواحمد محمد بن احمد بن غطریف نے جرجان میں روایت کیا ہے''۔(۱۹)

ابن غطریف مولف کے شیخ محمد بن الہیصم کے شیوخ میں سے ہیں(۲۰)۔ دوسری طرف خود مولف کے شیوخ ''حاکم نیساپوری''(۲۱) اور ''ابومنصور الازہری اللغوی''(۲۲) ہیں جو کہ سب کے سب مشرقی ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ مولف کے شاگرد رشید ''احمد بن ابی عمر'' بھی مشرقی ہیں، ان کے متعلق ابن الجزری لکھتے ہیں:

''احمد بن ابی عمر نام اور کنیت ابوعبداللہ الخراسانی ہے''۔

الغرض اسانید سے تو واضح ہے کہ کتاب المبانی کے مولف مشرقی ہیں، اس لیے محقق موصوف کا یہ خیال کہ وہ مغربی ہیں نا قابل قبول ہے، ایک اور محقق ڈاکٹر محمد ابوشہبہ نے محقق موصوف کے خیال کی تائید یہ کہہ کر کی کہ:

''اس مقدمہ کی خصوصیت الفاظ کی شستگی، زبان و بیان کی شگفتگی اور دلائل کی پختگی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف اندلس کے کوئی عالم ہیں''۔

حالانکہ اندلسی یا مغربی علماء کا کوئی ایسا منفرد اسلوب تحریر نہیں ہے جو مشرقی علماء کے اسلوب تحریر سے مختلف ہو۔

خلاصۂ بحث: آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ مختصر گذارشات، محققین اور تحقیقی اداروں کی توجہ مذکورہ بالا علماء اور ان کی تصنیفات کی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوگا، مقصد صرف یہ ہے کہ علماء کا یہ غیر معروف علمی حلقہ قرآنی مطالعہ کے میدان میں اپنا نمایاں مقام حاصل کر سکے اور

یہ واضح ہو سکے کہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں ہمارے ان تین علماء کے حلقۂ علمی نے قرآنی علوم کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اس حلقہ کی درمیانی کڑی ''ابومحمد حامد بن احمد بن احمد بن جعفر بن بسطام''، مولف تفسیر ''کتاب المبانی لنظم المعانی''، ہیں جن کے نام کی دریافت اوران کی شخصیت کا تعارف اس مقالے کا مقصد رہا ہے۔

اس حلقہ کی پہلی کڑی ''ابوعبداللہ محمد بن الہیصم''، مولف کتاب المبانی کے شیخ ہیں اور تیسری کڑی مولف کتاب المبانی کے شاگرد ''ابوعبداللہ احمد بن ابی عمر ہیں''۔

ان علماء کے بارے میں ہماری معلومات ابھی انتہائی محدود ہیں، جو کچھ ہے وہ ابن الجزری کی ''غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء'' میں مختصر اور تشنہ عبارت ہے۔ کاش کچھ مزید معلومات سامنے آسکیں۔

مراجع

(۱) کتاب قاہرہ میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی، مکتبۃ الخانجی۔ (۲) دیکھیے، مقدمتان فی علوم القرآن، ص ۳۔ (۳) المدخل لدراسۃ القرآن الکریم، ط۲، القاہرہ: ۱۹۷۳، ص ۳۵۔ (۴) مقدمتان، ص ۴۔ (۵) ایضاً، ص ۸، ۱۶، ۱۷ وغیرہ۔ (۶) ایضاً، ص ۸، ۱۶۔ (۷) ایضاً، ص ۱۶۔ (۸) ایضاً، ص ۱۰۔ (۹) کتاب الایضاح، ورقہ ۴ ظ۔ (۱۰) ایضاً، ورقہ ۲۳ ظ، ۶۳ و، ۲۰۵ و۔ (۱۱) دیکھیے، فہرست مخطوطات مصورۃ، ۱/۷۔ (۱۲) غایۃ النہایۃ فی طبقات القراء، قاہرہ ۱۹۳۲ء، ج ۱، ص ۱۳۔ (۱۳) محقق نے اس لفظ کے تحت حاشیہ لکھا ہے (شاید صحیح العتبی ہے) حالانکہ صحیح وہ ہے جو کتاب الایضاح میں آیا ہے یعنی (القتیبی) اور یہ ابن قتیبہ ہیں، دیکھیے: تاویل مشکل القرآن لابن قتیبۃ۔ (۱۴) دیکھیے کتاب الایضاح، ورقۃ ۸ و-۲۰ و-۲۲ ظ-۲۳ ظ-۲۴ و-۲۷ و، ۳۳ ظ، ۳۸ ظ-۲۰۵ و۔ (۱۵) غایۃ النہایۃ، ۲/۴۷۳۔ (۱۶) غایۃ النہایۃ، ۱/۲۰۲۔ (۱۷) مقدمتان، ص ۳۔ (۱۸) ایضاً، ص ۸۔ (۱۹) ایضاً، ص ۴۰۔ (۲۰) ایضاً، ص ۶۴۔ (۲۱) ایضاً، ص ۸۰۔ (۲۲) ایضاً، ۳۷-۵۷۔

اخبار علمیہ

''لا تحزن''

یہ معروف سعودی عالم شیخ عائض القرنی کی تصنیف ہے، ۵۸۴ صفحات پر مشتمل اس کا پہلا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں مکتبہ العبیکان، سعودی عرب سے شائع ہوا، اس میں ہجوم غم کو حیات انسانی کا سب سے بڑا بوجھ بتا کر قرآن وحدیث کی روشنی میں ایسی ہدایات کی نشان دہی کی گئی ہے جن پر عمل پیرا ہوکر انسان خوشیوں سے ہم کنار اور غموں کو در کنار کرسکتا ہے، العربیہ نیٹ کی خبر کے مطابق اس کو موجودہ دہائی کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب قرار دیا گیا ہے۔ دس میں ایک کروڑ سے زیادہ اس کی اشاعت ہوئی، اردو سمیت ۳۰ زبانوں جیسے جرمن، فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، فارسی، انگریزی اور یونانی وغیرہ میں اس کے ترجمے بھی ہوئے، کہتے ہیں کہ پھانسی سے پہلے صدام حسین کی چند چیزوں میں یہ کتاب بھی تھی اور جگہ جگہ اس پر ان کے قلم سے نشان بھی لگے ہیں۔ اہمیت ومقبولیت کے سبب اس پر برلن یونیورسٹی، جرمن اور عین الشمس یونیورسٹی مصر کی دو خواتین نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ مصنف مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے بقول رنگ ونسل اور مذہب وملت کے احساس سے اوپر اٹھ کر خالص انسانیت کے فائدہ کی نیت سے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے۔ بے پناہ مقبولیت میں نیت کی اس پاکیزگی کا بھی دخل ہے۔

''عہد براہیمی کی عمارت''

برطانوی ماہرین کی ایک جماعت عرصہ سے عراق کے آثار قدیمہ کی دریافت میں مصروف ہے، بغداد سے شائع ہونے والے عربی اخبار ''النہار'' کے مطابق گذشتہ دنوں ''حضرت ابراہیمؑ کے مولد شہر اُر'' سے ۱۵ کلومیٹر دور کھدائی کے دوران ایسی عمارت ملی جس کے بارے میں دعوی کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً چار ہزار برس قدیم ہے۔ یعنی یہ حضرت ابراہیم کے عہد کی یادگار ہے، طرز تعمیر کے انداز سے یہ قلعہ یا معبد کی قسم سے ہے، بڑے بڑے پتھروں کے استعمال کے سبب

ڈھانچہ اصل شکل میں برقرار ہے، اس کا سب سے صغیر الحجم پتھر ۷ فٹ پر مشتمل ہے، فصیل میں لگے پتھر اس سے بھی بھاری بھرکم ہیں، ماہرین کا خیال ہے کہ فرات میں سیلاب کی طغیانی کے سبب یہ عمارت مٹی میں دفن ہوگئی ہوگی، مشہور ہے کہ اس علاقہ میں چاند کی پرستش کی جاتی تھی، نمرود کا دارالحکومت یہی علاقہ تھا، ممکن ہے یہ نمرود کا تعمیر کردہ قلعہ ہو، عمارت کے علاوہ ۱۶/افراد کے ڈھانچے جو غالباً شاہی خاندان کے تھے اور سونے کے بنے ہوئے انسانی سر اور چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں سے بنے ہوئے آلات موسیقی بھی دستیاب ہوئے ہیں، معاہدہ کے مطابق دریافت شدہ تمام اشیا برطانوی میوزیم کی زینت ہوں گی۔

''ہندو مذہب کی نئی تعریف کے متعلق رام پنیانی کی وضاحت''

ناگپور کے انکم ٹیکس جج نے خیال ظاہر کیا ہے کہ تکنیکی لحاظ سے ہندومت کوئی مذہب نہیں اور ہندو کوئی مذہبی فرقہ نہیں ہے اور نہ ہی پوجا ارچنا اور مندروں کی دیکھ بھال کا تعلق مذہبی سرگرمیوں سے ہے، شیوٗ ہنومان اور درگا وغیرہ کسی خاص مذہب کی نمائندگی بھی نہیں کرتے وہ تو دنیوی طاقتیں ہیں، مشہور روشن خیال اسکالر رام پنیانی نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دلیل مضحکہ خیز اور گمراہ کن ہے، کیونکہ مورتی پوجا ہندو مذہب کا اہم حصہ اور ہندو مذہبی عمل ہے اور یہ کہنا کہ اس میں بے شمار الگ الگ مسلک ہیں تو یہ بات بھی تردید کے قابل ہے، کیونکہ ہندو مذہب کے مسلکی تشتت وتحزب کی اصل وجہ اس مذہب کا کوئی خاص پیغمبر کا نہ ہونا ہے۔ یہ مذہب قسطوں میں وجود میں آیا ہے لیکن یہ اختلافات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اسے خاص مذہب ماننے سے انکار کردیا جائے، ہاں یہ سچ ہے کہ ہندو مذہب کی کوئی قابل قبول تعریف مشکل ہے۔ اس کے متعدد اسباب ہیں، من جملہ ان کے ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس مذہب کی بنا و تاسیس کسی ایک بانی وشارع کی مرہون منت نہیں ہے، خاص بات یہ ہے کہ عہد بہ عہد قائم اور دیرینہ روایتیں اس مذہب کا آج بھی حصہ بنی ہوئی ہیں اور ستیہ نارائن سے سنتوشی اور درگا سے نراکار، نرگن ایشور کا تصور اس مذہب میں ایک ساتھ رائج ہے، اس میں ذات پات اور اونچ نیچ کے نظام کو مذہبی قبولیت ومنظوری حاصل ہے۔ رام پنیانی کے یہ خیالات موقر روزنامہ منصف

حیدرآباد میں مفصل شائع ہوئے ہیں۔

''اٹلس میموریل ریف''

متحدہ عرب امارات سے شائع ہونے والے روزنامہ ''البیان'' کی رپورٹ کے مطابق امریکی ریاست فلوریڈا میں سمندر کی ۴۰ فٹ گہرائی میں مذکورہ بالا نام سے ایک قبرستان تعمیر کیا گیا ہے، اسے Neptune Memorial Reef بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۶۵ ہزار مربع میٹر ہے، اس تہِ آب شہرِ خموشاں کے ذمہ داروں نے اس کے رقبہ کو ۱۱۶ ایکڑ تک وسیع کرنے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے، اس کی تعمیر زیر تکمیل ہے، اس کے مرکزی حصے میں بیٹھنے کے لیے سنگی نشستیں، کچھ مجسمے اور آمد و رفت کے لیے سڑکیں بھی تعمیر کی جائیں گی، ساڑھے آٹھ سو مردے اس میں دفن بھی ہو چکے ہیں، اس منصوبہ کا آغاز سب سے پہلے نیپٹون سوسائٹی میموریل ریف نامی تنظیم نے ۲۰۰۷ء میں کیا تھا، اس کے لیے اس نے عالمی اور سرکاری اداروں سے مالی تعاون بھی حاصل کیا ہے۔

''سرسید کا ورثہ - مغربی نقطۂ نظر سے''

پروفیسر گورڈن کیمپ بل، برطانیہ کی لیسٹر یونیورسٹی کے شعبۂ نشاۃ ثانیہ میں پروفیسر اور سعودی عرب میں برطانوی یونیورسٹیز کنسورشیم کے بانی صدر نشین ہیں۔ اسلام اور عالم اسلام پر تحقیقات اور مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے ان کو خصوصی دلچسپی ہے، ان دنوں وہ ''عصر حاضر کے اسلام'' کے موضوع پر کتاب لکھ رہے ہیں۔ پچھلے دنوں انہوں نے ''سرسید کا ورثہ - مغربی نقطۂ نظر سے'' کے موضوع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک یادگاری لیکچر دیا اور کہا کہ سرسید کو دوقومی نظریہ کے بانی کی حیثیت سے پیش کرنا درست نہیں، ان پر یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید ہندو اور مسلمانوں کے پرامن بقائے باہم پر مبنی نظریہ کے حامی تھے، انہوں نے سرسید کے نظریات کی روشنی میں مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو پس ماندہ طبقات سے بدتر بتایا، ان کے نزدیک اس کے اہم اسباب میں مراعات، مساوات، مواقع سے محرومی اور بہ حیثیت مسلمان ان کے ساتھ متعصّبانہ رویہ ہے۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

''رسالہ والدیہ'' ''گذشتہ'' کا املا''

بھیونڈی
۱۶/اپریل ۲۰۱۳ء

مکرمی و محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

'معارف (مارچ ۲۰۱۳ء) میں 'معارف کی ڈاک' کے تحت 'رسالہ والدیہ' کے ذیل میں ڈاکٹر محمد صابر کا ذکر آیا ہے۔ ناچیز کو یہ بتاتے ہوئے مسرت ہورہی ہے کہ مرحوم الٰہ آباد یونیورسٹی میں میرے ہم جماعت تھے۔ انہیں خلافت کے مسئلہ سے بہت دلچسپی تھی اسی لیے اپنے نام کے ساتھ 'اوغلو' کا اضافہ کرلیا تھا۔ گریجویشن کے بعد محمد صابر اوغلو ترکی چلے گئے تھے۔ اپنے عمر کے آخر حصہ میں وہ وطن تشریف لائے اور پچھلے دنوں الٰہ آباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

۲-'املا' کے ذیل میں جناب ابن غوری صاحب نے دو نکات ارشاد فرمائے ہیں:

(الف) لفظ 'گذشتہ' پر موصوف کا اعتراض درست نہیں ہے۔ 'گذشتہ' فارسی مصدر 'گذشتن' (بمعنی گزرنا) کا اسم مفعول ہے۔ ایک دوسرا مصدر ہے 'گذاشتن' جس کا معنی 'چھوڑ دینا' ہے۔ ایک مصدر 'گزاردن' بھی ہے۔ اس کا معنی بھی 'چھوڑ دینا' ہے لیکن اس لفظ کو 'بالذال' لکھنا درست نہیں ہے۔ اس کی صراحت لغت میں موجود ہے۔ (ملاحظہ ہو 'لغات کشوری'، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۴۰ء، ص ۳۹۷ نیز ص ۴۰۰)۔ البتہ 'گذارش' اور 'گزارش' دونوں صحیح ہیں۔ اول الذکر کا مصدر 'گذاشتن' اور ثانی الذکر کا 'گزاردن' ہوگا۔

(ب) عربی حروف کے رومن املا کے بارے میں عرض ہے کہ transliteration کے کچھ مسلمہ اصول ہیں جن پر پوری دنیا میں آج تک عمل ہورہا ہے۔ یہ اصول حروف کے مخارج کی رعایت سے ہیں۔ عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ قرآن میں تمام حروف تہجی کے املا کی تفصیل موجود ہے۔ کسی مسلمہ اصول کو بدلنا آسان نہیں۔ موصوف نے جو ترمیمات تجویز کی ہیں

وہ اس پورے اصول کو بدلنے کے مترادف ہیں جنہیں بین الاقوامی پیمانہ پر متعارف کرایا جاسکتا ہے لیکن اس کے قبول ہونے کی توقع کم ہے کیونکہ اس میں علامات کی کثرت ہے۔

۳- ناچیز کا مقالہ 'ایک قادیانی کی کتاب سیرت' عرصہ سے آپ کے پاس منتظر اشاعت ہے۔ یہ وہی مقالہ ہے جسے شبلی کالج کے عالمی سمینار Sirah in World Literature میں پیش کیا گیا تھا۔ توقع ہے کہ اسے آپ جلد ہی شائع فرمائیں گے۔ مخلص

(ڈاکٹر) محمود حسن الٰہ آبادی

'تصوف کیا ہے'؟

تغلق آباد، نئی دہلی
یکم مئی ۲۰۱۳ء

مکرمی سلام مسنون

'معارف' برابر مل رہا ہے، اس کرم فرمائی کے لیے شکریہ۔ میرے مضمون 'تصوف کیا ہے' (جنوری، فروری ۲۰۱۲ء) پر چند اہل علم کے مراسلے بشمول ایک استدراک شائع ہوئے تھے جن میں تصوف کے بارے میں میرے نقطۂ نظر پر تنقید کی گئی تھی۔ میں نے استدراک اور جملہ مراسلوں کا بروقت جواب بھیج دیا تھا، لیکن افسوس کہ نہ تو استدراک پر میرا تبصرہ شائع کیا گیا اور نہ ہی کوئی مراسلہ۔ اس عدم اشاعت کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میرا احساس ہے کہ ان مراسلات کو شائع نہ کر کے میرے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ یا تو میرے مضمون پر مراسلے شائع نہ کیے گئے ہوتے اور اگر شائع کیے گئے، بہت اچھا ہوا کہ وہ شائع کیے گئے تو پھر میرے جوابات کو بھی شائع کرنا ضروری تھا تاکہ قارئین معارف کو معلوم ہوتا کہ کس کی بات میں کتنا وزن اور سچائی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو میرا یہ خط شائع کر دیں تاکہ کوئی مراسلہ نگار اس خوش فہمی میں نہ رہے کہ میں نے ان کے اعتراضات کو درست تسلیم کرلیا ہے۔

اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' تبصرے کے لیے بھیج رہا ہوں، کسی قریبی اشاعت میں تبصرہ فرمادیں تو مشکور رہوں گا۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ خاکسار

الطاف احمد اعظمی

آثار علمیہ و تاریخیہ

خطوط ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

بنام پروفیسر سعید الظفر چغتائی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بیسویں صدی میں اسلامیات کے سب سے بڑے عالم (اسکالر) سمجھے جاتے ہیں۔ جرمنی کی بون یونیورسٹی اور فرانس کی ''پیرس یونیورسٹی سے قانون میں ڈاکٹریٹ کی اسناد حاصل کر کے عثمانیہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تھے۔ میری دانست میں برصغیر ہندو پاک میں کسی اور نے سوربون سے یہ اعلاترین سند (Docteur es Lettres) حاصل نہیں کی۔ زیادہ تر فرانسیسی میں لکھتے تھے، جس کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوتے رہتے تھے۔ میرے پاس ان کی شائع شدہ کتابوں کی جو منتخب فہرست ہے وہ نومبر ۱۹۸۰ء میں عائشہ بیگم نے المرکز الثقافی الاسلامی، حیدرآباد ہاؤس، فلاڈلفیا سے شائع کی تھی۔ اس کے صفحات میں فرانسوی، المانوی (German)، انگریزی، ترکی، عربی، فارسی اور اردو وغیرہ میں سو سے زیادہ تصانیف کا ذکر ہے۔ فرانس کے اہل علم کا کہنا تھا کہ اگر کسی نے اتنا کام چھاپا ہوتا جس کا ذکر اس کتابچہ کے ایک صفحہ میں ہے تو سوربون کا ممتاز پروفیسر ہو جاتا۔ مگر حمید اللہ آخری وقت تک فرانس میں پناہ گزیں رہے اور فقیرانہ شان سے کام کرتے رہے۔ ان کی آمدنی بس اتنی تھی کہ ضرورتیں پوری کر لیتے تھے۔ فرانس کے تحقیقی ادارہ CNRS سے کچھ مل جاتا اور کچھ عنقرہ (ترکی) یا ملیشیا سے مہمان استاد (Visiting Professor) کی حیثیت سے جو وہ اکثر چند ماہ کے لیے مقرر ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے کسی ملک کی شہریت قبول نہیں کی۔ وہ خود کو حیدرآباد کا شہری سمجھتے اور کہتے تھے کہ میری بنیادی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، شہریت لے کے کیا کروں گا۔ ساری زندگی مجرد رہے۔ ماجد میاں سے ان کی صرف قلمی ملاقات تھی۔ کہتے تھے حمید اللہ کو ''وعدہ'' پر کتنا بھروسہ ہے! مجھے گانا یاد آ گیا ''وعدہ ترا وعدہ!'' اور اپنا شعر:

فریب وعدۂ فردا بھی اب نہیں باقی نیا فریب کوئی دے کہ اعتبار کروں

اور کتابوں کے علاوہ فرانسوی میں سیرت پر مفصل کتاب کے مصنف تھے۔قرآن کا ترجمہ کیا تو اس وقت مغربی دنیا کی ہر معلوم زبان میں ترجموں کی مکمل فہرست دی۔ ابوسفیان اصلاحی سلمہ نے اپنی حالیہ کتاب ''مطالعات قرآن'' (لاہور ۲۰۰۶ء) کے آخری باب میں آپ کی قرآنی خدمات کا پچیس صفحات پر مشتمل جائزہ پیش کیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر حمیداللہ کے پاس دس بارس زبانوں میں تراجم قرآنی دیکھے ہیں۔ ایک میز پر بیک وقت سات آٹھ زبانوں میں مختلف لوگوں سے گفتگو کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سنا ہے۔ رسالہ ''برہان'' دہلی میں ان پر میں نے مضمون چھاپا ہے (۱۹۷۵ء)۔

اپنے قیام پیرس و لُند کے دوران ان کی خدمت میں ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۹ء تک برابر حاضر ہوتا رہا۔ انہوں نے فرانسیسی زبان میں بال جبریل کا ہمارا ترجمہ دیکھا، اس کی اصلاح فرمائی، اس پر اضافے کیے اور اس کی اشاعت میں بڑی مدد کی، جیسا کہ آپ خطوں میں پڑھیں گے۔ پھر پیرس سے میرا گزر چند ہی بار ہوسکا۔ آخری ملاقات برازیل سے واپسی پر اثنائے راہ جنوری ۱۹۸۱ء میں ہوئی۔ حمیداللہ نے امیرکا کی سرزمین پر شاید اکتوبر ۲۰۰۲ء میں انتقال فرمایا اور ۹۶ سال کی عمر پائی۔ آخری برسوں میں پچھلا حافظہ جواب دے گیا تھا۔ لیکن بیگم ثریا حسین اور چودھری نعیم کے مطابق آخری وقت تک پڑھتے لکھتے رہے۔ انتقال کے بعد سے ان پر کئی کتابیں ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہوئی ہیں اور بہت سے مضامین چھپے ہیں جن میں سے کچھ 'تعمیر حیات' لکھنؤ میں مل جائیں گے۔

ذیل میں ان کے ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۳ء تک تیئیس (۲۳) خط شامل ہیں۔

۱۔۶

Paris VI

دوشنبہ۔۱۱/جمادی الآخر ۱۳۸۳ھ

مکرمی دام لطفکم۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پرسوں کے اجتماع میں آپ کا پیام پہنچا دیا تھا۔ آیندہ سنیچر کو اسی وقت آٹھ بجے شب ''موجودہ ایران'' پر ایک لکچر ہوگا۔ فرصت ہو تو شرکت فرمایئے۔

اس جلسے میں کتاب Initiation a l' Islam کا بھی ذکر آیا۔ وہاں تجویز ہورہی ہے کہ قرض لے کر مطلوبہ سات ہزار فرانک مجتمع کیے جائیں اور کتاب خرید لی جائے۔ تین ہزار تو جمع ہو چکے ہیں۔ باقی کے لیے کچھ احباب اس میں حصہ لے سکتے ہیں تو ابوالفتاح زیادہ صاحب سے معاملت فرمایں۔ جیسے جیسے کتاب فروخت ہوتی جائے گی۔ یہ قرض واپس کیے جاتے رہیں گے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

مخلص

محمد حمید اللہ

۶۔۲

4 r.Tournon VI

۲۷/ج ۲ ۱۳۸۳ھ

مکرمی دام لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شام عنایت نامہ ملا۔ ہم میں بہت کوتاہیاں ہیں۔ ترقی کے لیے آغاز بہر حال ہونا چاہیے۔ یہ بھی غنیمت ہے ع کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں۔

ممکن ہے کل ملاقات ہو سکے۔ فرانسیسی کتاب ابھی بھنور ہی میں پھنسی ہے۔ **المستغاث الی اللہ۔**

مخلص

حمید اللہ

۶۔۳

بسم اللہ

Edibiyat Fakultesi

Istambul

۱۱/ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ

مکرمی دام لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل کالج میں آپ کا عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوا۔

کتاب ''تعارف اسلام'' کے آیندہ اڈیشن میں اصلاحات کی تجویزوں کا شکریہ۔ اسے فی الحال متعلقہ فائل میں رکھ چھوڑتا ہوں۔ صرف اتنا کہتا چلوں کہ میری رائے میں کسی بھی غیر مسلم ناظر کے جذبات مذہبی کو اس کتاب سے ٹھیس نہ لگنی چاہیے۔ تاکہ Pre Judicial نہ ہو جائے۔

دیگر مذاہب کی پیشین گوئیوں کو وہ لوگ اور معنی دیتے ہیں۔اوران کا رسول عربی پر اطلاق ان کو برانگیختہ کردیتا ہے۔اسی لیے ایک اہم باب سے کتاب عمداً خالی ہے۔دوسرے یہ صحیح نہیں کہ میں نے جہاد کو ''تعارف اسلام'' سے حذف کردیا ہے، بلکہ کافی طویل بحث کی ہے۔

یہاں کی موجودہ شدید وکثیر مصروفیتوں میں اس کی توقع نہ رکھیں کہ میں آپ کے سوالات کا کوئی تفصیلی جواب دے سکوں، خاص کر جب کہ یار زندہ صحبت باقی۔میرے ساتھ سیرت کی کتاب سفر میں نہیں ہے۔ویسے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے سوالوں کا اس میں جواب ہے۔جن عورتوں یا عورت نے اعوذ باللہ منک کہا تھا وہ جبراً نکاح کے باعث نہ تھا بلکہ سوکنوں کے سکھانے پر کہ اجس لفظ سے رسول اللہ خوش ہوتے اور محبت زیادہ کرتے ہیں۔تریا چرتر تھا، بیچاری بھولی اس کا شکار ہوگئی تھی۔

مولانا علی میاں نے وعدہ فرمایا تھا کہ میری بعض علمی دریافتوں کا جواب دیں گے۔اسے دو سال ہوگئے۔میں خودغرض نہیں ہوں۔اس لیے ان کی مشغولیتوں میں تیسری اور چوتھی یاددہانی کی گستاخی یا جسارت نہیں کرنا چاہتا، خدا ان کا سایہ بہت دن سلامت رکھے۔

یوسف صاحب ملنے آئے تھے اور آپ کا سلام بھی پہنچایا تھا۔وہ یہاں سے دور رہتے ہیں۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

۶-۴

Edibiyat Fakultesi
Istambul

۲۰/ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ

مکرمی دام لطفکم۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہاں یکم مئی کو عید بہار کی، ۴/مئی کو کوئی مقامی سرکاری عید کی اور اتوار کو فرنگیانہ ہفتہ وار عید کی تعطیل تھی۔اس لیے آج آپ کے عنایت نامے کو پانے اور جواب دینے کی مسرت حاصل کررہا ہوں۔

بعض وقت آپ کے خط کی عبارتیں طبیعیات کے فارمولوں کی طرح ہوتی ہیں۔سمجھنے

کے لیے ذرا محنت کرنی پڑتی ہے اور پھر بھی یہ یقینی نہیں کہ جو سمجھا وہ صحیح ہو۔ میرا اشارہ آپ کے یوسف صالح صاحب کے متعلق اشارے سے ہے۔ کیا آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا میری دانست میں ان کو کوئی فرنگستانی اسکالرشپ کے دلانے کا امکان ہے؟

اگر ایسا ہے تو آپ مجھ سے بہتر اس سے واقف ہیں کہ فرنگی اسکالرشپ کہاں اور کس طرح ملتے ہیں۔ غالباً مقامی سفارت ملک متعلقہ کو دراخوست دینی پڑتی ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرتی ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہوں کہ درخواست کے وقت ایک تصدیق یا سفارش کا خط دے دوں! اگر کوئی اور مراد ہے تو معاف فرمایئے میں سمجھ نہ سکا کیا اچھا ہوا گر آپ اپنی طبیعت کی سادگی کی طرح اپنا اسلوب بھی سادہ بنائیں، جس میں تکلفات کی جگہ راست مقصدرسی ہو۔☆

والسلام

نیازمند محمد حمید اللہ

۶-۵

Edibiyat Fakultesi
Istambul

۸/ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ

مکرمی دام لطفکم

سلام مسنون۔

عنایت نامہ ملا۔ شکرگزار ہوں۔

کئی سال قبل جب یہ عنوان ذہن میں آیا کہ ’’اسلام کیوں‘‘ کوئی دوسرا دین کیوں نہیں؟ تو حسب عادت بساط بھر تیاری خود ہی شروع کردی۔ لیکن مجبوراً اس سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہ ایک آدمی کے بس کی چیز نہیں معلوم ہوتی، سارے کم از کم اہم تر ادیان پر ضرورت ہے کہ کام بٹا جائے اور ہر مخلص دردمند ایک ایک مذہب میں تخصص پیدا کرے۔ سطحی چیزیں لکھنے سے دیکھا گیا کہ الٹا اثر پڑتا ہے کہ جس طرح بے ہودہ اعتراضات اسلام اور جناب رسالتؐ پر ہونے سے مسلمان پڑھنے سننے والے پر ردعمل ہوتا ہے۔ اسلامیات کے اتنے ماہر یہودی و نصرانی ہیں۔ آنسو بھر آتے

☆ یہ مشورہ سونے کے جلی حروف میں لکھ کر مشتہر کرنے کے قابل ہے۔

ہیں کہ بدھ مت تک کا کوئی اچھا عالم ہم میں پیدا نہ ہوا☆۔

میری عادت نہیں کہ دوسروں کو احکام دوں اس لیے بساط بھر اپنے ہی معلومات بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس سال ترکی میں ہفتے میں ایک لکچر ''تقابلی مذاہب'' ہر پڑدے رہا ہوں اور اس کی خاطر مجبور ہوا ہوں کہ اس موضوع پر کچھ پڑھوں۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ معلومات کب اتنے ہو سکیں گے کہ ان کو شائع کرنے کی ہمت کر سکوں۔ **السعی منا و الاتمام من الله**۔

دنیائے اسلام کی حالت سے ہر روز ایسی کوفت ہوتی ہے کہ کام کا شوق بھی متاثر ہو جاتا ہے۔

مدینہ منورہ جانے کا ویزا مانگا تو انقرہ میں عربی قنصل نے جواب دیا کہ حج کے لیے یا صرف ماہ رجب میں عمرے کے لیے ویزا ملتا ہے، باقی کسی زمانے میں کسی کو ویزا نہیں دیا جاتا ہے، ''ہمارا ملک کوئی ٹورسٹ ملک نہیں ہے''، **یصدون عن المسجد الحرام** کی آیت تو ابوجہل کے متعلق وارد ہوئی تھی۔ **انا لله و انا الیه راجعون**۔

مخلص

محمد حمید اللہ

ایک عرض ہے کہ خط میں اپنا پتہ لکھنے سے اجتناب نہ فرمائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مرسل الیہ کو وہ ہمیشہ از بر رہے۔ خفیف سی غلطی سے بھی خط ضائع ہو جاتا ہے۔ اس وقت آپ کا صحیح پتہ یاد نہیں۔ اٹکل پر لکھ رہا ہو۔ خدا کرے مل جائے۔

۶-۶

کوہ سین مشل
پنجشنبہ، ۱۶/ جمادی الاخر ۱۳۸۴ھ

مکرمی دام لطفکم

سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ ملا۔ ممنون ہوا۔ میں پاریس میں نہیں ہوں غالباً جمعہ کی نماز بھی پاریس میں نہ مل سکے گی۔ بہت ممکن ہے کہ اتوار تک بھی واپس نہ آسکوں۔ اگر آپ اس اتوار کو جلسے میں شریک ہو رہے ہیں تو میری غیر حاضری کی معذرت فرما دیں۔ اور یہ ایک چھوٹی، بہت چھوٹی خوش خبری سنا دیں کہ ایک اہل خیر نے انجمن کو ساڑھے پانچ پونڈ کی رقم چندہ دی ہے جو انشاء اللہ اپنی واپسی پر گزران دوں گا۔

☆ اردو میں تو علمی رسالے بھی اسلام کے علاوہ کسی مذہب پر کوئی سنجیدہ تحریر شاید ہی قبول کریں۔

آپ کی ساری تجویزیں مناسب ہیں۔ کامیابی خدا کے ہاتھ ہے۔ اگرچہ گزشتہ سالوں کا تجربہ یہ ہے کہ......(۱) بلدالجامعہ (۲) میں اگر اجتماع کی اجازت مل سکے تو زیادہ نوجوان آسکتے ہیں۔

شاید عملی طریقہ یہ ہو کہ اولاً ایک مختصر تحریک پیش کی جائے کہ انجمن سے دلچسپی بڑھانے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ اس میں حتی الامکان ہر ملک کا ایک ایک آدمی لیا جائے۔ ہوسکے تو کوئی کالے بھائی کو بھی لایا جائے۔

ایک تدبیر یہ بھی ہوسکتی ہے اور فوری تعمیل کی کہ آٹھ دس ہفتوں کا پروگرام پیشگی مقرر کر کے اس نظام العمل کو سائکلو اسٹائل سے چھاپیں اور زیادہ سے زیادہ تقسیم کریں۔ جس کو جس عنوان سے دلچسپی ہوگی آجائے گا۔ لیکن اچھے مقرروں کا کوئی بدل نہیں ہے۔

بہرحال انشاء اللہ جلد آپ سے ملاقات ہوگی۔ فی الوقت عنایت نامے کا رسید کے ساتھ صرف شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ مخلص

محمد حمید اللہ

۶۔۷

پاریس

۶؍رجب ۱۳۸۴ھ، چہارشنبہ

مکرمی دام لطفکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معاف فرمایئے کہ جواب میں دیری ہوئی۔ دو تین دن سے بے طرح مصروف رہا۔

آپ کا سوال تدبر اور ایمان بالغیب کے متعلق بے شک قابل غور ہے۔ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ محسوسات کو انسان اپنے کسی نہ کسی حس سے معلوم کر لیتا ہے۔ خدا، قیامت وغیرہ پر ایمان بالغیب لانے ہی کے لیے حواس کی جگہ تفکر، تدبر، تعقل وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ابن سینا نے خدا کو Necessary Being کا نام دیا ہے کہ وہ محسوس تو نہیں ہوتا لیکن

(۱) یہاں کئی سطریں دُھل گئی ہیں۔ (۲) مراد Cite Universitaire سے ہے، جہاں پیرس یونیورسٹی کے طلبا کی بہت سی اقامت گاہیں واقع ہیں، جو فرانس کے مختلف 'صوبوں' یا دوسرے ملکوں نے بنوائی ہیں۔ امریکا اور ہندوستان نے بھی۔

اس کا وجود ضروری ہے۔

گزشتہ اتوار کو میں نے ''اسلام ہند میں'' پر تقریر کی۔ مجمع ذرا زیادہ ہی تھا۔ آیندہ اتوار کو آپ کا انتظار رہے گا۔ **حفظکم الله وعافاکم** ۔

نیازمند

محمد حمید اللہ

۶۔۸

4,r.Tournon,Paris VI

مکرمی۔ سلام مسنون۔

ایک بد بخت عربی نام والے کی وجہ سے (جسے مسلمان کہہ کر میں اسلام کو بدنام کرنا نہیں چاہتا) مسلمان طلبا کی انجمن کے اجتماعات اب Rue Vaugirard میں نہیں ہو سکتے۔ آیندہ اتوار سے یہ مکان رفیعی صاحب Vincenne, Chateau de 62, Bd de la Liberation, میں ہوا کریں گے۔ تفصیل اب انشاءاللہ ملاقات پر۔

اطلاعاً عرض ہے تا کہ آپ بے وجہ Convention جانے کی زحمت نہ فرمائیں۔

مخلص: محمد حمید اللہ

۶۔۹

4,r.Tournon,Paris VI

۱۱رشعبان ۱۳۸۴ھ

محترمی۔ سلام مسنون ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا عنایت نامہ ایک ایسا مسئلہ چھیڑتا ہے جس کا کوئی جواب کبھی سارے انسانوں کو مطمئن نہ کرے گا۔ وہی لوگ جو ہمارے مذہب کے کسی تنکے پر اعتراض کرتے ہیں، اپنے مذہب کی شہتیروں کو بھی بے تکلف اور بے سوچے سمجھے درست تسلیم کر لیتے ہیں۔

مزید براں سارے آدمی ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ مٹھی بھی ''عقل پرست'' ہیں تو باقی سارے ہی اوہام پرست وخوش عقیدہ ہوتے ہیں۔

فرشتوں کو ایک مستقل مخلوق کہیے یا قوائے فطریہ میں سے ایک، فرق کیا ہوا؟ قوائے فطریہ بھی تو خدا کی ایک مخلوق ہیں۔ مَلَک کے معنی ہیں سفیر، فرستادہ۔ ''فرشتہ'' بھی فرستادن سے

نکلا ہے یعنی بھیجا ہوا۔ خدا کسی کام پر کسی کو مامور کرتا ہے تو وہ حدا کا فرشتہ ہی ہوتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے ’’ آمنت بلا کیف‘‘ مجھے اس کے وجود پر ایمان ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ وہ چیز کیسی ہے۔ ان چیزوں کو جتنا کریدو، کنکر زیادہ ہی ہوتے جاتے ہیں۔ گویا کوئی اہم تر اور مفید تر چیز ہمارے سوچنے کی دنیا میں باقی ہی نہیں رہتی۔

موجودہ انجیلیں کس نے لکھیں؟ انجیل نامی ساٹھ کتابوں میں سے مروجہ چار کا کس طرح انتخاب ہوا؟ پہلے ان تاریخی مسائل کا جواب حاصل کیا جائے، پھر ان کے مندرجات کی صحت و عدم صحت پر بحث ہو سکے۔

پادری Lammans نے قرآن پر کچھ...... کہا جائے تو پادری صاحب کے پاس کیا باقی رہ جائے گا۔

بہر حال ضرورت ہے کہ ہم میں نصرانیات کے متخصص بھی پیدا ہوں۔ تیرہ سو برس سے ہم غافل رہے۔ مشہور عام کتنی چیزیں نہیں ہیں جو سینہ بہ سینہ آنے کے باوجود بے اصل ہیں۔ پھر Hallucination بھی اب ایک مسلمہ اور علمی حقیقت ہوگئی ہے۔ آدمی کچھ سوچتا ہے اور وہی اس کو نظر آنے لگتا ہے۔ نیازمند: محمد حمید اللہ

مکرر: جب یہ مسلم ہے کہ ایک شبیہ اور ہم شکل کو سولی دی گئی تو ماں کو دھوکا ہونا آسان ہے۔ مردے کی شکل میں اتنی تبدیلی ہو جاتی ہے، خاص کر سزائے موت کے باعث کہ غلطی آسان ہے [۱]

۱۰۔۶

4, Rue de Tournon,Paris VI

۱۰؍شعبان ۱۳۸۵ھ۔ پنجشنبہ

مکرمی دام لطفکم۔ سلام مسنون۔ خیرت کا طالب

یونیسکو کی ایک کانفرنس کے سلسلے میں مس شمل آیندہ ہفتے یہاں آنے والی ہیں۔ بعض

---

[۱] شاید میں نے کسی پادری کی گفتگو سنی تھی اور وہاں یہ بحثیں ہوئی تھیں، جو میں نے حمید اللہ صاحب کے سامنے رکھ دیں۔ پورا خط محفوظ نہ رکھ سکا، جگہ جگہ سے دُھل گیا ہے۔ جو پڑھ ملتا ہے حاضر کر رہا ہوں۔ یہ کیفیت کئی اور خطوں کی بھی ہوئی ہے۔

مذاکرات کے سلسلہ میں اقبال کی کتاب کی ضرورت ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کوئی وقت بتا سکیں کہ آ کر یہ کتاب حاصل کرسکوں؟ ؎

مخلص

محمد حمید اللہ

۶۔۱۱

4,1. Tournon,Paris VI

۲۱؍شعبان ۱۳۸۵ھ ۔منگل

مکرمی دام لطفکم ۔ سلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی زحمت فرمائی پر ممنون بھی ہوں اور شرمندہ بھی ۔

مس شمل آیندہ اتوار کی شام کو آنے والی ہیں ۔ آج کل وہ امریکا میں ہیں ۔ یہاں یونیسکو کی کوئی کانفرنس ہے مگر مجھے اس کے نظام العمل کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ۔

مخلص

محمد حمید اللہ

(باقی)

؎ Amnemarie Schimmel کی کتاب Gabriel's Wing بال جبریل کا ترجمہ نہیں، اقبال پر فاضل اہل قلم کا مقالہ تحقیقی ہے جس پر انہوں نے Bonn University سے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی ۔ ۱۹۶۴ء میں چھپتے ہی ایک کاپی ڈاکٹر حمید اللہ کے پاس آئی اور انہوں نے خود میرے ہوٹل تک لاکر مجھے پڑھنے کے لیے عنایت فرمائی تھی ۔ اس حکم کے تحت میں نے ان کے نگران خانہ کو واپس کر دی ۔

دارالمصنّفین کا سلسلۂ مکاتیب

۱- مکاتیب شبلی حصہ اول	سید سلیمان ندویؒ	قیمت =/150
۲- مکاتیب شبلی حصہ دوم	// // //	قیمت =/180
۳- برید فرنگ	// // //	قیمت =/35
۴- مشاہیر کے خطوط بہ نام سید سلیمان ندویؒ		قیمت =/45

ادبیات

نعت

اشرف رفیع

یہ شب ماہتاب ان کے لیے
ضوفشاں آفتاب ان کے لیے

زحل و مریخ و مشتری زہرہ
آب و تاب شہاب ان کے لیے

کنت کنزا کی علت غائی
خلقت بے حساب ان کے لیے

فرش کے سب خزانے ان کے ہیں
عرش سب بے نقاب ان کے لیے

عشق کی انتہا پہ ان کے قدم
حسن کامل جناب ان کے لیے

طور سینا پہ تھا حجاب میں وہ
اٹھ گئے سب حجاب ان کے لیے

سب صحیفے تھے اک زماں کے لیے
تا ابد اک کتاب ان کے لیے

جن کے نعلین عرش تک پہنچے
عبد کامل خطاب ان کے لیے

لی مع اللہ یہ عبدیت ان کی
انا بشر حجاب ان کے لیے

کیسے لے جاوگی وہاں اشرفؔ
دل و جانِ خراب ان کے لیے

17-7-106، یاقوت پورہ، حیدر آباد، اے پی۔

مطبوعات جدیدہ

فتاوی ندوۃ العلماء (جلد اول): ترتیب و تحقیق مولانا منور سلطان ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: مجلس صحافت و نشریات، ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، پوسٹ بکس نمبر ۹۳ لکھنؤ، یوپی۔

اسلامی معاشرے میں فتوی دراصل ایک نہایت اہم ضرورت کی ادائیگی کی ایک شکل ہے، یہ ضرورت مسلمان معاشرے کے اقتصادی، معاشی، سیاسی اور سماجی تقاضوں پر محیط ہے لیکن اصلاً یہ قرآن و حدیث کی بنیاد پر احکام کے علم و خبر کی فراہمی ہے اسی لیے شارع اسلام سے اب تک یہ ایک مسلسل اور زندہ روایت کی صورت میں موجود بھی ہے اور موثر بھی، شریعت کے مبادی کا علم تو واضح ہے لیکن زمانہ کے تبدل و ارتقاء کے عمل سے ایسے مسائل بھی سامنے آتے ہیں جن کے حل کے لیے زمانہ کی تبدیلیوں پر نظر ناگزیر ہو جاتی ہے، اصل معاملہ اسی نظر کا ہے جو بیک وقت شارع کی حکمت و مصلحت اور زمانہ کی ضرورت دونوں سے بخوبی واقف ہو، ندوۃ العلماء کے قیام کے مقاصد میں یہ واضح تھا کہ اعتقاد و عمل کے متعلق اگر کوئی بات دریافت طلب ہو تو ندوۃ العلماء اس کی صحیح رہنمائی کر سکے، ندوۃ العلماء کے بانیوں کی نظر میں یہ حقیقت ضرورت تھی کہ علماء کی نظر حالات زمانہ پر کم ہے، اس ناواقفیت کی وجہ سے پیچیدگیوں کو سلجھانا آسان نہیں، ظاہر ہے کہ جب پیچیدگی سے صحیح طور پر واقفیت نہ ہوگی تو صحیح جواب یا حل کیوں کر ہوگا، ندوہ کا یہ مسلک و اصول بھی شروع سے رہا کہ فروعی و فقہی مسائل میں حتی الامکان ایسے اختلافی مسائل سے پرہیز کیا جائے جس سے باہمی منافرت میں اضافہ ہو۔ اسی ضرورت کے پیش نظر مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی سرپرستی میں ندوہ نے باقاعدہ دارالافتاء قائم کیا اور یہ مسلسل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا، لیکن یہ کام زیادہ سرگرمی سے مولانا مفتی محمد ظہور ندوی کی سرپرستی میں ہوا اور آج بھی مولانا مدظلہ کی نگرانی میں یہ جاری ہے۔ اس کی کارکردگی کا اندازہ صرف اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۴۱۱ھ سے ۱۴۳۰ھ یعنی قریب بیس سال میں جو فتاوی، رجسٹر میں درج کیے گئے ان کی تعداد پچیس ہزار سے زیادہ ہے لیکن ان فتاوی کی اشاعت کیا ان کی ترتیب بھی عمل میں نہیں آئی تھی، لیکن ان کی اہمیت

کے پیش نظر کئی برسوں سے ان کی ترتیب پر توجہ دی گئی جس کا ثمرہ زیر نظر کتاب کی شکل میں سامنے آیا جس میں کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ کے تحت وضو، تیمّم، غسل، حیض ونفاس، نجاست، اوقات نماز، اذان واقامت کے علاوہ علم، تعلیم، قرآن، سیرت انبیاء اور جنت وجہنم کے متعلق بھی صحیح مستند معلومات کو پیش کیا گیا ہے اور فتاوی کی اصل خوبی کہ معاملہ کی حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے کا ایسا اہتمام کیا گیا ہے جو ان فتاوی کو دوسرے رائج فتاوی کی شکل سے ممتاز کرتا ہے، استفتاء اور استفسار دونوں کا رنگ اس میں شامل ہے، مثلاً عالم کون ہے اور علماء کے وارث ہونے کا مطلب کیا ہے، قرآن مجید کا مقصد نزول اور یہ کہ کیا بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے یا یہ کہ قرآن کب مکمل ہوا، لولاک لما خلقت الافلاک کی تحقیق کیا ہے، حضور اکرمؐ کا سینہ مبارک کیوں چاک کیا گیا یا کیا حضرت ماریہؓ باندی تھیں وغیرہ، ایسے سوالات ہیں جو روایتی طور پر استفتاء کے ضمن میں شاید شمار نہ کیے جاتے ہوں لیکن اسلام اور قرآن وحدیث سے واقفیت کی راہ میں یہ رہنمائی اور مشکل کشائی کی افادیت ضرور رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ سائل اور مستفتی کی رعایت سے نہایت آسان فہم ہیں، مولانا مفتی ظہور ندوی، مولانا ناصر علی ندوی مرحوم اور مولانا نیاز احمد ندوی کی تحریر یا تصویب کی شکل میں ان فتاوی کی تحریر میں مولانا محمد طارق ندوی مرحوم مولانا محمد ظفر عالم ندوی، مولانا محمد مستقیم ندوی، مفتی ساجد ندوی اور مولانا مسعود حسن حسنی ندوی کی معاونت شامل ہے اور یہ وہ علماء ہیں جنہوں نے خاص طور پر افتاء میں تخصص کیا، اس مفید اور کارآمد مجموعہ کی خوش ترتیبی کا ذکر بھی ضروری ہے، لائق مرتب نے حوالہ جات کی تحقیق و تخریج کا قابل تحسین فریضہ انجام دیا جس سے اس مجموعہ کی منزلت دوبالا ہوگئی۔ مولانا سید محمد رابع ندوی کے وقیع مقدمہ کے ساتھ مفتی محمد ظہور ندوی کی تحریر خوشگوار مسرت بلکہ حیرت کا احساس دلاتی ہے۔

درآئینہ باز ہے: از جناب محمد سہیل عمر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۳۸، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی، ۱۱۶-میکلوڈ روڈ، لاہور پاکستان۔

کلام و پیام اقبال کے بلند پایہ اور معتبر و مستند شارحین میں اس کتاب کے فاضل مصنف کو امتیازی شان حاصل ہے اور ان کی دوسری متعدد کتابوں اور مقالات ومضامین کی طرح زیر نظر کتاب

بھی ہمارے دعوے کی ایک اور مضبوط دلیل ہے، اس کتاب کا مرکز ومحور، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ہے، علامہ اقبال کی یہ کتاب ان کے شعری مجموعوں کی طرح مقبولیت کے اتفاق عام سے ہم کنار نہیں ہوئی، فلسفہ وکلام کے باب میں ایسا ممکن بھی نہیں، تشکیل جدید کا مقصد جتنا واضح اور شفاف تھا کہ عہد جدید کے لیے اسی کے رائج اسلوب میں دین کی حقیقتوں کی ایسی نقاب کشائی کی جائے جس کی روشنی سے شکوک وشبہات کی تاریکیاں دور ہوں اور یہ سچائی سامنے آجائے کہ علوم جدیدہ کا حاصل، اصول دین سے متصادم نہیں، لیکن اس واضح مقصد میں عہد جدید کی فکر سے جو مکالمہ ہوا، وہ بعض ذہنوں کے لیے اجنبی اور نامانوس ہونے کی وجہ سے نامقبول ہی نہیں مطرود و مردود کے درجہ تک پہنچا دیا گیا، زیر نظر کتاب کے مباحث اسی ابطال وانکار کی ذہنیت کا رد ہیں اور بقول مصنف اس کے ابواب میں سوال و جواب، مباحث وتحلیل مباحث، مسائل اور رد مسائل، اشکال اور حل اشکال کا وہ رزمیہ پھیلا ہے جو تشکیل جدید کی چھاؤں میں برپا ہوا''، تجزیے کی ذیلی سرخی کے تحت نو مضامین ہیں جن کو تشکیل جدید کے مضامین نو سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، پس منظر کے عنوان کے تحت چار مضامین شاید اس لیے شامل کیے گئے ہیں کہ ان سے علامہ کی شخصیت اور اسلام اور پاکستان کے تعلق سے ان کے نظریات کی وضاحت، قارئین کو باقی مباحث کے لیے وہ ذہنی فضا مہیا کر سکے جس میں سانس لے کر تشکیل جدید سے صحیح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے مثلاً پروفیسر ایوب صابر کے مشہور مضمون 'اقبال کی شخصیت پر اعتراضات کا جائزہ' کے تعارف میں مصنف نے بڑی خوبصورتی سے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ''جن لوگوں کا تصور شعر اور مقیاس الشعراء قصباتی نوعیت کا ہے وہ اقبال کی شاعری کو اسلامی تہذیب کے جمال وزیبائی کا نمونہ جاننے کی بجائے اسے اپنے اسی دہقانی پیمانے پر ناپتے رہتے ہیں' یا یہ کہ '' شکست خوردہ انا اپنے لیے کہاں کہاں اور کیسی کیسی پناہیں تراشتی ہے، یہ لکھنے والے کے ذوق، تاب ہزیمت اور طاقت فرار یا خوئے انتقام پر منحصر ہے'' ۔ایک مضمون میں انہوں نے علامہ کے مجموعی کام پر نظر کرنے کے لیے تین حصوں یعنی تصور انسان، تصور کائنات اور تصور خدا پر غور وفکر کی ضرورت پر زور دیا ہے اور ثبوت میں خود علامہ کے اس مصرعہ کو پیش کیا کہ ع چیست عالم، چیست آدم، چیست حق، اقبال اور پاکستان کے عنوان سے بھی عمدہ بحث ہے، اس کا آخری جملہ یہ ہے کہ ''ہم اقبال کے بغیر آزادی

تو حاصل کر سکتے تھے مگر اسے برقرار نہیں رکھ سکتے'' ایک تجزیاتی مضمون ''سزا یا ناسزا شبلی، شاہ ولی اللہ اور اقبال کے حوالے سے'' ہے۔ تشکیل جدید میں علامہ نے جہاں عرف و رواج کی رعایت کے معاملہ پر بحث کی ہے وہاں شاہ صاحب کی حجۃ اللہ سے ایک حوالہ دیا ہے، اس کا حوالہ علامہ شبلی نے الکلام میں دیا، مصنف کا خیال ہے کہ اقبال نے شبلی پر اعتماد کیا لیکن الکلام کی عبارت اور اصل حجۃ کی عبارت میں اختلاف ہے اور اسی وجہ سے اخذ نتائج میں کچھ غلطی ہوئی، یہ مضمون شبلیات پر داد تحقیق دینے والوں کے لیے خاص طور طر توجہ کے لائق ہے۔ حدیث و فقہ پر مصنف کے تجزیے جس دقت نظر سے پیش کیے گئے ہیں ضرورت ہے کہ اسی توجہ اور غائرانہ نظر سے ان کا مطالعہ کیا جائے، ایسی قیمتی کتاب کی اشاعت کے لیے اقبال اکادمی مستحق تبریک ہے، ہم اس لیے بھی اکادمی کے شکر گزار ہیں کہ وہ برابر اپنی کتابوں سے دارالمصنّفین اور معارف کو نوازتی رہتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کتابوں کا ذکر خاصی تاخیر سے ان صفحات میں آپاتا ہے۔

نقوش رفتہ: از جناب شاہد عمادی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۲۴۰، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: شاہد عمادی 3/2 وکاس کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ اور لکھنؤ اور ممبئی کے مکتبے۔

کئی شخصیتیں ہیں، مشہور و معروف بھی اور گم نام و کم نام بھی، کچھ قریب اور کچھ دور، کچھ پاس سے گزر گئیں اور کچھ کے پاس سے گزر رہوا، لیکن حساس دل اور نظر کے لیے سب نے نقوش چھوڑے جو دل پر مرتسم اور نگاہوں میں منقسم ہوتے رہے، فاضل مصنف کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے ہے جس کی نمایندہ شخصیتوں میں حکیم صفدر حسین، عبداللہ عمادی اور مولانا ابراہیم عمادی جیسے نام ہیں جن کے کام کا گذشتہ ایک صدی کی دنیائے علم میں شہرہ رہا، حکیم صفدر حسین، دیار پورب شیراز ہند کے نامور طبیب ہی نہیں، صدیوں کی علمی و مذہبی روایت کے امین بھی تھے۔ مولانا عبداللہ عمادی بقول حضرت مولانا علی میاں ''اپنے عہد کی بزم علم و ادب کے اہم رکن اور وسیع سیارات میں کوکب روشن تھے''، رسالہ الندوہ کے مدیر اور پھر وقت کے مشہور اخبار، وکیل کے بھی ایڈیٹر ہوئے، سرسید کے تہذیب الاخلاق کا احیاء انہوں نے ہی کیا، زمین دار، لاہور سے بھی وابستہ رہے، سب سے بڑھ کر نظام حیدرآباد ان کو ہمارے قاموس اور ہمارے جاحظ کہہ کر خطاب

کرتے، مولانا ابراہیم عمادی اخبار خلافت کی مجلس ادارت کے فعال رکن، کئی بہترین کتابوں کے مصنف تھے، اس کتاب کے مصنف ان ہی کے لائق فرزند ہیں، نانا، چچا اور والد کو انہوں نے جس طرح دیکھا اور پایا ظاہر ہے ان سے اچھا بیان کس کا ہوسکتا ہے ہے، یہ بزرگ اور سعید الحق عمادی تو گھر کے تھے، مولانا علی میاں، معین الدین حارث، خلیل شرف الدین، قاضی اطہر مبارک پوری، شہاب الدین دسنوی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی بھی تعلق میں گھر والوں سے کم نہ تھے، ان سب کا ذکر جس سادہ لیکن بڑے موثر اور دلنشین انداز میں کیا گیا ہے اور تاثرات کے ساتھ ان اصحاب کی علمی و ادبی شناختوں کے نقوش جس طرح روشن کیے گئے ہیں، اس سے یہ تذکرہ رفتگاں بڑا وقیع اور مفید اور معلومات افزا ہوگیا ہے، مصنف کا خاصا وقت ممبئی میں گزرا، وہاں کی کئی شخصیتوں کا ذکر ہے اور یہ ممبئی ہی کی طرح بڑا حسین اور دلنواز ہے، مرزا فضل کریم خاں ہوں، عبدالحمید فقیہ ہوں یا پارس ناتھ مصرا، ہر ایک پڑھنے والے کی عقیدت کا مرکز بن جاتا ہے۔ شروع میں اعظم گڑھ اور آخر میں ممبئی کی تاریخ کے کچھ ایسے نقوش ہیں جو بڑے دلچسپ ہیں، اعظم گڑھ کی چند بستیوں جیسے برنگی، انباری، خراسوں، کرخیا، قصبہ وغیرہ کا تعلق ایشیائے کوچک ہی نہیں اندلس سے بھی جوڑا گیا ہے، ممبئی کے متعلق یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''آج جبکہ لکھنؤ دلی کے اکثر نامنور اہل علم خانوادوں کی نسلیں اردو سے بالکل نابلد ہیں، ممبئی کا بچہ بچہ اردو کا شیدائی ہے'' یہ اور بات ہے کہ ''ممبئی اپچی کے طوفان بلاخیز میں صدیوں کی قدریں لمحوں میں چکنا چور ہوگئی ہیں''۔ دارالمصنّفین سے مصنف کا تعلق قدیم اور دیرینہ ہے، انہوں نے لکھا کہ غالباً ۱۹۱۴ء میں دارالمصنّفین کا قیام عمل میں آیا، یہاں غالباً کی ضرورت نہیں، سال قیام ۱۹۱۴ء ہی ہے، یہ قول بھی بر بنائے محبت ہے کہ ''افسوس کہ تحریک آزادی کے اس تاریخی مرکز کو آج کے اہل سیاست نے تباہ کرنے کی ٹھانی ہے''، اتنی اچھی کتاب میں کتابت کی غلطیاں اچھی نہیں لگتیں، ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ کی ایک کتاب کا نام فرائڈ لکھ دیا گیا، استفادہ حاصل کرنا بھی ہے، صنعاء کو صبغاء، تہذیب الاخلاق کو تہذیب و اخلاق، شبیر احمد عثمانی کی جگہ شبیر حسن، نجیب اشرف کو مجیب اشرف لکھ دیا گیا، آخر میں کئی مشاہیر کے خطوط کا عکس بھی ہے، شروع میں ملک زادہ منظور صاحب کی تحریر بھی بہت خوب ہے، ان کا یہ کہنا ہمارے دل کی بھی آواز ہے کہ شاہد عمادی نے ایسے عظیم

کرداروں کو موضوع بنایا جو ہمارے شاندار علمی، ادبی اور مذہبی رویوں کے نمایندہ ہیں، جنہوں نے ساری زندگی علم و دانش اور دین و ادب کی خدمت میں صرف کردی۔

مہاراشٹر کی مختصر تاریخ : از جناب پرویز عالم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: مرزا ورلڈ بک ہاؤس، جنسی روڈ قیصر کالونی، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱، مہاراشٹر۔

مہاراشٹر کا صوبہ یا خطہ اپنے نام کی طرح قومیت کے عناصر کے لحاظ سے واقعی عظمت رکھتا ہے، قدیم اور اہم تہذیبوں کی سرزمین کی حیثیت سے اجنتا اور ایلورا اس کی شناخت ہیں تو مختلف قوموں، مذہبوں اور تہذیبوں کا امتزاج ہمیشہ سے اس کے لیے افتخار کی وجہ رہا، یہ کہنا صحیح ہے کہ مہاراشٹر کی تاریخ کی تدوین، ہندوستان کی تاریخ مرتب کرنے کی طرح ہی آسان نہیں اور اردو زبان میں تو اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا، مصنف داد کے لائق ہیں کہ انہوں نے کم صفحات میں اتنی جامع اور مستند کتاب تیار کردی، مہاراشٹر کی وجہ تسمیہ، محل وقوع کی جغرافیائی تفصیلات ہوں یا پھر تاریخ کے دریچوں سے آریوں کی آمد سے قبل کے مناظر کی تصویر کشی ہو یا پھر آریوں کے بعد موریہ خاندان کی حکومت ہو، قدیم خود مختار ریاستیں ہوں، ان سب کی تاریخ، راجاؤں کا عہد بہ عہد ذکر اور ساتھ ہی تہذیبی و تمدنی تفصیل اسی خوبی سے بیان کی گئی جس طرح مسلمانوں کے عہد، خلجی، تغلق، بہمنی، نظام شاہی، برید شاہی، عماد شاہی اور مغل حکومت کی تفصیلات ہیں۔ مراٹھا اور مملکت آصفیہ، انگریز اور پھر گذشتہ صدی سے اب تک کے سماجی، سیاسی انقلابات اور ان کے پس منظر میں نمایاں شخصیات غرض اس کتاب میں کوئی پہلو تشنہ نہیں، آخری صفحات میں یہ ساری تفصیلات، نقشوں میں اس طرح آگئی ہیں کہ چند سطروں سے پڑھنے والے کی نظر میں سارے ادوار گزر جاتے ہیں اور سب سے خوبی کی بات وہی ہے جس کی طرف ڈاکٹر مرزا محمد خضر نے اشارہ کیا کہ طلبہ کے ساتھ عام قاری کی دلچسپی کا بھی سامان ہے۔

ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

(۱) ادراک معنی: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ ناگپور، مہاراشٹر۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

(۲) تحقیق و تدوین سمت اور رفتار: ڈاکٹر محمد موصوف احمد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

(۳) تفسیر ماجدی نقد و نظر: نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی، صدق فاؤنڈیشن، خاتون منزل، حیدر مرزا روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

(۴) تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد: ڈاکٹر شاداب عالم، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۱۲۴ روپے

(۵) حیات نعمانی: عتیق الرحمٰن سنبھلی، الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱، نظیر آباد، لکھنؤ۔ قیمت: ۴۵۰ روپے

(۶) روداد چمن: مولانا محمد الحسنی، مجلس صحافت و نشریات، ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، لکھنؤ۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

(۷) عبدالقوی دسنوی حیات و خدمات: محمد نعمان خان، کوثر صدیقی، آفاق حسین، دبستان بھوپال، زیب ولا، A-۹۷ گنوری، بھوپال۔ قیمت: ۲۱۱ روپے

(۸) کتابیں (۲): ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۰۵ روپے

(۹) متاع نقد و نظر: مولانا مستقیم احسن اعظمی، ادبی دائرہ، عقب آواس وکاس کالونی، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

(۱۰) نقوش جاوداں: پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم، تقدیم و ترتیب: ڈاکٹر شباب الدین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ قیمت: ۲۸۰ روپے